اُردو

(لازمی)

برائے جماعت دہم

علمی کتاب خانہ

کبیر سٹریٹ اُردو بازار لاہور فون: 37248129 ,042-37353510

جملہ حقوق بحق پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ محفوظ ہیں۔
منظور کردہ: پنجاب کری کولم اتھارٹی، وحدت کالونی، لاہور۔
بمطابق مراسلہ نمبر PCA/13/576 مورخہ 11-10-2013
اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپرز، گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مؤلفین: پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — صدر شعبہ اُردو (ر) جامعہ پنجاب
ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی — سینیئر ماہرِ مضمون اُردو (ر)

مدیر: ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی — سینیئر ماہرِ مضمون اُردو (ر)

کمپوزنگ: مقصود گرافکس — اُردو بازار، لاہور۔

اراکین ریویو کمیٹی:

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
۲۔ ڈاکٹر احسان الحق	چیئرمین شعبہ اُردو، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور
۳۔ پروفیسر طارق حبیب	شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا
۴۔ پروفیسر غلام حسین ساجد	سابق صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور
۵۔ پروفیسر محمد ظفر الحق چشتی	صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ دیال سنگھ کالج، لاہور
۶۔ پروفیسر تابندہ جبیں	شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، بھاگٹانوالہ ضلع سرگودھا
۷۔ عبدالمعبود عابداللہ	گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول، وحدت کالونی، لاہور
۸۔ سرفراز احمد فتیانہ	ماہرِ مضمون اُردو، پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۹۔ ڈاکٹر محمد سہیل سرور	ڈیسک آفیسر، پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

نگران: ظہیر کاشر وٹو

پرنٹر: الحجاز پرنٹرز لاہور

ناشر: علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔
042-37353510, 37248129, 35018291

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مارچ 2018ء	اوّل	اوّل		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

فہرست

نمبر شمار	عنوان	شاعر	صفحہ نمبر
۱	حمد	حفیظؔ جالندھری	۲
۲	نعت	احسان دانشؔ	۸

حصّہ نثر

نمبر شمار	عنوان	مصنّف	صفحہ نمبر
۳	مرزا محمد سعید	شاہد احمد دہلوی	۱۳
۴	نظریۂ پاکستان	ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان	۲۲
۵	پرستان کی شہزادی	اشرف صبوحی	۲۹
۶	اردو ادب میں عید الفطر	ڈاکٹر وحید قریشی	۴۲
۷	مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ	سجاد حیدر یلدرم	۴۸
۸	مُلَمَّع	ہاجرہ مسرور	۶۰
۹	چُغل خور	شفیع عقیل	۷۰
۱۰	نام دیو مالی	مولوی عبدالحق	۸۰
۱۱	علی بخش	قدرت اللہ شہاب	۸۸
۱۲	استنبول	حکیم محمد سعید	۹۵
۱۳	خطوطِ غالبؔ	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	۱۰۳
۱۴	خطوطِ رشید احمد صدیقی	رشید احمد صدیقی	۱۰۹

حصّہ نظم

نمبرشمار	عنوان	شاعر	صفحہ نمبر
۱۵	میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت	میر انیسؔ	۱۱۷
۱۶	فاطمہ بنتِ عبداللہ	علامہ محمد اقبال	۱۲۴
۱۷	کسان	جوشؔ ملیح آبادی	۱۲۸
۱۸	جیوے جیوے پاکستان	جمیل الدین عالیؔ	۱۳۳
۱۹	اونٹ کی شادی	دلاور فگارؔ	۱۳۸
۲۰	مال گودام روڈ	مرزا محمود سرحدی	۱۴۲

حصّہ غزل

نمبرشمار	عنوان	شاعر	صفحہ نمبر
۲۱	مُصیبت بھی راحت فزا ہوگئی ہے	حسرتؔ موہانی	۱۴۸
۲۲	آدمی آدمی سے مِلتا ہے	جگرؔ مرادآبادی	۱۵۲
۲۳	سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنّا بھی نہیں	فراقؔ گورکھپوری	۱۵۷
۲۴	یہ فخر تو حاصل ہے، بُرے ہیں کہ بھلے ہیں	اداؔ جعفری	۱۶۱
۲۵	فرہنگ		۱۶۵
۲۶	اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے	شگفتہ صغیرالحسنین ترمذی	۱۷۷
۲۷	بہادر بچے	ناصر بشیر	۱۸۳

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء–۱۹۸۲ء)

محمد حفیظ نام اور حفیظؔ تخلص تھا۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ گھریلو حالات سازگار نہ تھے، اس لیے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ شعروشاعری کا فطری ذوق رکھتے تھے، چناں چہ بچپن ہی میں شعر کہنے لگے۔ مولانا غلام قادر گرامیؔ کی شاگردی اختیار کی۔ مختلف ادبی رسائل میں لکھتے رہے۔ مشاعروں نے انھیں شہرت دی۔ مختلف سرکاری محکموں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے آئے۔ ۱۹۸۲ء میں لاہور میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار اقبالؒ پارک میں، مینارِ پاکستان کے قریب واقع ہے۔

زبان کی صفائی اور سادگی، سوز و گداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ پاکستان کا قومی ترانہ ان کی ایک باعثِ فخر تخلیق ہے۔ انھوں نے دیگر بہت سی قومی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ حفیظؔ جالندھری ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن (مثنوی، گیت، غزل اور نظم وغیرہ) میں طبع آزمائی کی۔

شاہ نامہ اسلام ان کی ایک قابلِ قدر تخلیق ہے۔ یہ اردو کی قومی، ملی اور رزمیہ شاعری میں عمدہ اضافہ ہے۔ ان کی چند تصانیف یہ ہیں: تلخابۂ شیریں، سوز و ساز، حفیظ کے گیت، حفیظ کی نظمیں، چیونٹی نامہ۔

حمد

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو حمد کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے آگاہ کرنا۔
۲۔ حمد کے ذریعے اللہ سے لَو لگانے کا جذبہ پیدا کرنا۔
۳۔ طلبہ کو حفیظ جالندھری کی نظم گوئی کی خوبیوں سے رُوشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ کو غزل اور نظم کے اصطلاحی معنی سے آگاہ کرنا اور ان کا فرق واضح کرنا۔

اُسی نے ایک حَرفِ کُن سے پیدا کر دیا عالَم
کشاکش کی صدائے ہاؤ ہُو سے بھر دیا عالم
نظامِ آسمانی ہے اُسی کی حکمرانی سے
بہارِ جاودانی ہے اُسی کی باغبانی سے
زمیں پر جلوہ آرا ہیں مظاہر اُس کی قدرت کے
بچھائے ہیں اُسی داتا نے دستر خوان نعمت کے
یہ سرد و گرم، خشک و تر، اُجالا اور تاریکی
نظر آتی ہے سب میں شان اُسی کی ذاتِ باری کی
وہی ہے کائنات اور اس کی مخلوقات کا خالق
نباتات و جمادات اور حیوانات کا خالق
وہی خالق ہے دل کا اور دل کے نیک ارادوں کا
وہی مالک ہمارا اور ہمارے باپ دادوں کا
بَشَر کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا جس نے
محمد مصطفیٰ ؐ کے نام پر شَیدا کیا جس نے

(انتخابِ نعت جِلد پنجم مؤلف: عبدالغفور قمر)

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:
(الف) اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات کون سا ایک لفظ کہ کر بنائی ہے؟
(ب) اللہ تعالیٰ نے انسان کو کن نعمتوں سے نوازا ہے؟ چند ایک تحریر کیجیے۔
(ج) اُجالے اندھیرے اور خشک و تر کس کے مظاہر ہیں؟
(د) حمد میں خالق کی کن مخلوقات کا ذکر کیا گیا ہے؟
(ہ) اِس نظم ''حمد'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۲۔ درجِ ذیل الفاظ سے مصرعے مکمل کریں:

مخلوقات، آسمانی، مظاہر، بشر

(الف) نظامِ .... ہے اُسی کی حکمرانی سے

(ب) زمیں پر جلوہ آرا ہیں ....اس کی قدرت کے

(ج) وہی ہے کائنات اور اس کی .... کا خالق

(د) .... کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا جس نے

۳۔ نظم ''حمد'' کے متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

الف) نظم ''حمد'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟

(i) احسان دانشؔ (ii) جمیل الدین عالیؔ

(iii) حفیظؔ جالندھری (iv) جوشؔ ملیح آبادی

(ب) کائنات کا وجود اللہ تعالیٰ کے:

(i) احکامات کا نتیجہ ہے (ii) چاہنے کا نتیجہ ہے

(iii) حرفِ کُن کا نتیجہ ہے (iv) اِن سب کا

(ج) نظامِ آسمانی اور بہارِ جاودانی میں کون سی بات مشترک ہے؟

(i) خالق ایک ہے (ii) ردیف ایک ہے

(iii) دونوں کائنات کا حصّہ ہیں (iv) ایک ہی نظام کے عناصر ہیں

(د) یہ عالم اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے بھر دیا ہے؟

(i) رنگ و بُو سے (ii) مخلوقات سے

(iii) جمادات و نباتات سے (iv) اِن سب سے

(ہ) ذاتِ باری تعالیٰ کی شان کہاں نظر آتی ہے؟

(i) سرد و گرم میں (ii) خشک و تر میں

(iii) اُجالے اور تاریکی میں (iv) ان سب میں

(و) اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتِ اسلام پر پیدا کر کے کون سا اور احسان کیا؟

(i) رزق و صحت دی (ii) یہ سب کچھ دیا

(iii) اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیدا کیا (iv) عقل و شعور کی دولت دی

۴۔ کالم (الف) کے الفاظ کالم (ب) سے ملائیں:

کالم (الف)	کالم (ب)
ایک حرفِ کُن	فطرتِ اسلام
بہارِ جاودانی	عالم کا پیدا ہونا
بَشَر کا پیدا ہونا	باغبانی سے
کائنات	دسترخوانِ نعمت
بچھائے	خالق

۵۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

الفاظ	متضاد
شمس	
سرد	
تر	
تاریکی	
خالق	
ثابت	

۶۔ درجِ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے:

حرفِ کُن، صدائے ہاؤ ہُو، کشاکش، بہارِ جاودانی، جلوہ آرا، جمادات، بَشَر

۷۔ حمد کے مطابق الفاظ کو ترتیب دے کر مصرعے بنائیں:

(الف) قدرت، اس کی، جلوہ آرا، زمیں پر، ہیں، مظاہر، کے

(ب) کا، خالق، نباتات و جمادات، حیوانات، اور

(ج) سے، نظامِ آسمانی، حکمرانی، اسی کی، ہے

(د) جس نے، بشر کو، پیدا کیا، فطرتِ اسلام پر

(ہ) باپ دادوں، کا، ہمارا، وہی مالک، اور، ہمارے

۸۔ حمد کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۹۔ حمد کے ہر شعر میں ہم آواز الفاظ موجود ہیں، ان کی نشان دہی کیجیے۔

۱۰۔ درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے:

حرف کن، جمادات، نباتات، بشر، نعمت

۱۱۔ حمد کے تیسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کیجیے۔

نظم:

نظم کے لغوی معنی تنظیم اور ترتیب کے ہیں۔ عام مفہوم کے مطابق تو ہر کلامِ منظوم، نظم ہے لیکن اصطلاحِ سخن میں نظم ایسی مسلسل اور مربوط صنف ہے، جس کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔ شاعر اسی مرکزی خیال کو ذہن میں رکھ کر داخلی اور خارجی تاثرات قلم بند کرتا ہے۔ نظم کے لیے ہیئت اور موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ پوری نظم ایک بحر میں ہوتی ہے اور اس میں قوافی کا ایک معیّن نظام ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کو محمد حسین آزادؔ، مولانا حالیؔ، علامہ محمد اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، حفیظؔ جالندھری، ظفر علی خان، احسان دانشؔ اور فیض احمد فیضؔ نے نظم کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

غزل:

غزل عربی لفظ ہے لیکن اس صِنفِ سخن کو ایرانیوں نے رائج کیا۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنا، کے ہیں۔ ہرن جب خوف زدہ ہو کر دردناک چیخ مارتا ہے تو اُسے بھی غزل کہتے ہیں۔ اگرچہ غزل بھی نظم ہی ہوتی ہے لیکن اصطلاح میں غزل شاعری کی وہ قدیم قسم ہے جس میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات کا ذکر درد و سوز سے کیا جاتا ہے۔ یہ شاعر کی داخلی کیفیات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اب غزل کے موضوعات میں اتنی وسعت آچکی ہے کہ مضامین کے اعتبار سے یہ انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور پوری غزل ایک بحر میں ہوتی ہے۔ اس کے مطلع کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ جب کہ دیگر اشعار کا ہر دوسرا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ میر تقی میرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، داغؔ دہلوی اور فیض احمد فیضؔ کے علاوہ بھی بہت سے نمایاں غزل گو شعرا ہیں۔

نظم اور غزل میں فرق:

غزل بنیادی طور پر تو نظم ہی ہے البتہ معروف معنوں میں نظم کے اشعار مرکزی خیال کے مطابق ایک ترتیب میں ہوتے ہیں جب کہ غزل کا ہر شعر الگ اکائی ہوتا ہے۔ غزل کے ہر شعر کا الگ مفہوم ہوسکتا ہے۔ جو سوز و گداز غزل کا لازمہ ہے وہ نظم کا نہیں ہے اور جو شکوہِ لفظی نظم میں ممکن ہے، وہ غزل میں نہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ طلبہ باری باری یہ حمد تحت اللّفظ پڑھیں۔

۲۔ خوش الحان طلبہ یہ حمد ترنّم سے پڑھیں۔

۳۔ اس حمد میں اللّٰہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں، اُنھیں جملوں میں ایک چارٹ پر خوش خط لکھیں اور اسے جماعت کے کمرے میں آویزاں کریں۔

۴۔ کسی اور معروف شاعر کی حمد تلاش کر کے کاپی میں لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو حمدیہ شاعری کی روایت سے آگاہ کرنا اور بتانا کہ اردو زبان کی ابتدا سے حمدیہ شاعری کی بھی ابتدا ہوگئی تھی۔

۲۔ طلبہ کو حمد، نعت اور منقبت کا فرق بتایا جائے۔

۳۔ شاعر نے شعروں میں قرآنی آیات کا ذکر کیا ہے۔ کائنات کے پیدا کرنے، کُنْ فَیَکُوْنَ، دلوں کے بھید جاننے غرض ہر شعر میں ایک آیت کا حوالہ موجود ہے۔ آپ یہ آیات طلبہ کو سنائیں۔

۴۔ حمد کو ترنّم سے پڑھوانے کا اہتمام کیا جائے تاکہ بچوں میں عقیدت و احترام کے علاوہ ذوقِ جمالیات بھی پیدا ہو۔

☆☆☆

نعت

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو نعت کے محاسن سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ میں حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جذبہ اُجاگر کرنا۔
۳۔ طلبہ کو نعت سے، بطورِ ایک صنفِ سخن، متعارف کرانا۔

دو عالم کا اِمدادگار آ گیا ہے
امین آ گیا، غم گُسار آ گیا ہے

غریبوں کی جاں کو، یتیموں کے دِل کو
سکُوں ہو گیا ہے، قرار آ گیا ہے

اُصولِ محبّت ہے، پیغام جِس کا
وہ محبوبِ پروردگار آ گیا ہے

اب انساں کو انساں کا عرفان ہو گا
یقیں ہو گیا، اعتبار آ گیا ہے

بُجھے گا نہ جِس کا چراغِ محبت
وُہ پیغمبرِ ذی وقار آ گیا ہے

زمانے کو اب اپنی منزل مُبارک
کہ اِک خضرِ صد رہ گزار آ گیا ہے

(انتخابِ نعت جِلد پنجم، مؤلف: عبدالغفور قمر)

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:
(الف) نعت کے پہلے شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کون سی صفات بیان کی گئی ہیں؟
(ب) دوسرے شعر کے مطابق کس کو سکون ملا ہے؟
(ج) انسان کو انسان کا عرفان ہونے سے کیا مراد ہے؟
(د) شاعر کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پیغام کیا ہے؟
(ہ) نعت کے آخری شعر میں خضر سے کون سی ہستی مراد ہے؟

۲۔ نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) یہ نعت کس شاعر کا ہدیۂ عقیدت ہے؟

(i) حفیظ جالندھری (ii) حفیظ تائب

(iii) احسان دانش (iv) ماہر القادری

(ب) متن کے مطابق محبوبِ پروردگار کا پیغام کیا ہے؟

(i) اُصولِ محبت (ii) غم گُساری و غریب نوازی

(iii) امانت داری (iv) یہ سب ہیں

(ج) اب انسان کو کس کا عرفان حاصل ہوگا؟

(i) خدا تعالیٰ کا (ii) انسان کا

(iii) کائنات کا (iv) اِن سب کا

(د) زمانے کو منزل کے مبارک ہونے کی نوید کیوں دی گئی ہے؟

(i) کامل رہنما کے آنے سے (ii) اِک خضرِ صدرہ گزار کی آمد کی وجہ سے

(iii) انساں کا عرفان ہونے سے (iv) کسی کی بھی نہیں

(ہ) پیغمبرِ ذی وقار کے چراغِ محبت کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟

(i) وشن تر ہوگا (ii) ہمیشہ روشن رہے گا

(iii) کبھی نہیں بجھے گا (iv) یہ سب درست ہیں

۴۔ درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں:

عالم، سکوں، عرفان، محبت، منزل

۵۔ الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں:

غم گُسار، قرار، یقین، پیغام، ذی وقار

۶۔ درجِ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے:

اصول، اعتبار، چراغ، عرفان، رہ گزار

۷۔ مناسب لفظ چُن کر مصرعے مکمل کریں:

(الف) مُجھے گانہ جس کا________محبت

(ب) ________ہوگیا ہے، قرار آ گیا ہے

(ج) اب انساں کو انساں کا________ہوگا

(د) ________کو اب اپنی منزل مبارک

۸۔ نعت کے متن کو مدنظر رکھ کر کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیے:

کالم (الف)	کالم (ب)
امداد گار	پیغام
اُصولِ محبت	رہ گزار
یقیں	غم گُسار
خضر	عرفان
انساں	اعتبار

سرگرمیاں

۱۔ طلبہ میں نعت خوانی کا مقابلہ کرایا جائے۔
۲۔ ہر طالبِ علم اپنی پسند کا ایک ایک نعتیہ شعر خوش خط لکھ کر اپنے استاد کو دکھائے۔
۳۔ نعت پڑھنے اور سننے کے آداب خوش خط لکھ کر جماعت کے کمرے میں آویزاں کیے جائیں۔
۴۔ چند اور نعتیں تلاش کریں اور جماعت کے کمرے میں دیگر طلبہ کو سنائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو نعت پڑھنے اور سُننے کے آداب بتائے جائیں۔
۲۔ طلبہ کو ذہن نشین کرائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسمِ گرامی سُنیں، پڑھیں یا لکھیں تو دُرود پڑھنا لازم ہو جاتا ہے۔
۳۔ چند بڑے نعت گو شعرا کا تعارف کرایا جائے۔

طلبہ کو درجِ ذیل احادیثِ مبارکہ سنائی جائیں:

الف۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔

ب۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جب تک کوئی مجھ پر درود بھیجتا رہتا ہے، اس وقت تک فرشتے اس کے لیے دُعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

حصّہ نثر

شاہد احمد دہلوی

(۱۹۰۶ء-۱۹۶۷ء)

شاہد احمد دہلوی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پوتے اور مولوی بشیر الدین احمد کے فرزند تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لیا لیکن شدید بیمار ہوگئے چناں چہ طبّی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعد ازاں دہلی سے انگریزی ادبیات میں بی اے آنرز کیا۔ ایم اے فارسی کا امتحان بھی پاس کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد شاہد احمد دہلوی کراچی منتقل ہوگئے اور تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی ادب سے تراجم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پاکستان رائٹرز گِلڈ کی تشکیل میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں مجموعی ادبی خدمات کی بنا پر تمغا برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

شاہد احمد دہلوی زبان و بیان پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ان کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ وہ موسیقار بھی تھے لیکن اردو ادب ہی ان کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مشورے پر انھوں نے خاکہ نگاری شروع کی۔ گنجینۂ گوہر (جس سے زیرِ نظر خاکہ لیا گیا ہے) اور بزمِ خوش نفساں ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی تصانیف میں اُجڑا دیار، دِلّی کی بپتا اور دھان کے کھیت شامل ہیں۔

مرزا محمد سعید

تدریسی مقاصد

۱۔ دِلّی کی تہذیب، خصوصاً مُتمَوّل طبقے کی معاشرت سے تعارف کرانا۔
۲۔ شاہد احمد دہلوی کی شُستہ اور با محاورہ زبان کی خوبیوں سے طلبہ کو رُوشناس کرانا۔
۳۔ خاکہ نگاری کے اِس نمونے کے ذریعے سے طلبہ کو تحریک دینا کہ وہ مزید خاکوں کا مطالعہ کریں۔
۴۔ طلبہ پر واضح کرنا کہ اہلِ علم حلیم الطبع اور وضع دار ہوتے ہیں۔
۵۔ طلبہ کو علمی مجالس اور اہلِ دانش کے طور طریقوں سے رُوشناس کرانا۔
۶۔ نئے الفاظ اور تراکیب سے واقفیت دلانا۔
۷۔ خاکہ، جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ کا تعارف کرانا۔

صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر مرزا محمد سعید کا آج سوئم ہے۔ خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالتِ مزاج یا مرض الموت کی اطلاع اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملی۔ حد یہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور اُن کے سیکڑوں دوستوں اور قدر دانوں کو اس سانحۂ اِرتحال کی خبر تک نہ ہوئی۔ افسوس! اتنا بڑا صاحبِ کمال ہم میں سے اُٹھ جائے اور اُس کی سناؤنی ہم تک نہ پہنچے۔ کتنے بے خبر ہیں ہم لوگ! زندہ قوموں کا یہ شِعار نہیں ہوتا کہ اپنے اہلِ کمال سے غافل ہو جائیں۔ ایسی غفلت مجرمانہ ہوتی ہے۔ شاید یہ ہماری غفلت ہی کی سزا ہے کہ مرزا صاحب کو یوں ایکا ایکی ہم سے چھین لیا گیا۔

عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔ ابھی ہم کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کے رخصت ہو جانے سے ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اب ان کی عدم موجودگی رہ رہ کر ہمیں ان کی یاد دلائے گی اور وقت کے ساتھ اُن کی جدائی کا گھاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے، یعنی اتنے خاموش کہ خود اُن کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ دراصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے، کام کرتے تھے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر۔ کام کرتے تھے اپنی تسکین کے لیے۔ کام کرتے تھے اس لیے کہ انھیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انھوں نے ساری عمر نہیں کیے۔ انھوں نے اب سے ۵۵ سال پہلے سر عبدالقادر[1] کے رسالے مخزن میں مضامین لکھے، مگر شیخ صاحب کی فرمائش پر نہیں، بلکہ جب خود اُن کا جی لکھنے کو چاہا۔

۱۔ شیخ سر عبدالقادر، معروف ادیب اور علامہ محمد اقبالؒ کے گہرے دوست تھے۔

مرزا صاحب کسی کو خوش کرنے کے لیے نہیں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب پیسے کے لیے بھی نہیں لکھتے تھے۔ پیسے کی تو انھوں نے کبھی پروا نہیں کی، بلکہ پیسے کے ذکر پر وہ چِڑ جاتے تھے اور انھیں منانا مشکل ہو جاتا تھا۔ لاہور کے اکثر پبلشروں نے مرزا صاحب سے کتابیں لکھوانی چاہیں اور بڑی بڑی رقمیں پیش کیں مگر مرزا صاحب نے انھیں ایک لفظ بھی لکھ کر نہیں دیا اور جب اپنا پہلا ناول یاسمین لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو بے مُزد دے دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسرا ناول خوابِ ہستی لکھا۔ اسے بھی بغیر کچھ لیے دے دیے چھپوا دیا۔

ایک پبلشر صاحب لاہور سے دِلّی محض اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائیں گے۔ مَیں نے انھیں سمجھایا کہ مرزا صاحب نہیں لکھیں گے، مگر وہ بڑے بڑے مصنّفوں کو خرید چکے تھے، نہ مانے۔ بولے: ''ہم انھیں ایک ناول کا ایک ہزار روپیا دیں گے تو وہ کیوں نہیں لکھیں گے؟'' یہ وہ زمانہ تھا کہ دو ڈھائی سو روپے میں اچھا خاصا ناول پبلشر کو مل جاتا تھا چناں چہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مَیں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ پبلشر صاحب نے چُھوٹتے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ بولے: ''آپ میرے ناول کے پانچ ہزار دے دیں گے، دس ہزار دے دیں گے، مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں، اُسے چھوڑ کر آپ کے لیے ناول لکھوں۔'' پانچ دس ہزار کی بات سن کر پبلشر صاحب کی سِٹّی گم ہوگئی اور دو چار منٹ پہلو بدل کر رُخصت چاہی۔ مرزا صاحب اس زمانے میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب مذہب اور باطنیت لکھ رہے تھے، جسے مکمل ہونے کے بعد ان کے دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی[1] ان سے لے گئے اور لاہور سے وہ کتاب شائع ہوئی۔ مرزا صاحب کا صرف یہی ایک علمی کارنامہ ہے، مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر سو عمدہ کتابیں چھانٹی جائیں تو ان میں مذہب اور باطنیت کو ضرور شریک کرنا پڑے گا۔

مرزا صاحب دِلّی کے شرفا کے ایک متموّل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ترِاہا بیرم خان سے آگے بڑھ کر ایک راستہ سیدھے ہاتھ کو مُڑ جاتا ہے، اسی کے نکّڑ پر مرزا صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی علاقے میں سر سید احمد خاں[2] کا قدیم مکان بھی تھا۔ سر سید سے بھی مرزا صاحب کی عزیز داری تھی، اور منشی ذکاءاللہ[3] سے بھی ان کی قرابت داری ہوگئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال پہلے دلّی کے مسلمان شُرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا، مگر سر سیّد نے مسلمانوں کے اس غلط نظریے کی بہت کچھ اصلاح کر دی تھی۔ اسی زمانے میں دِلّی کے دو نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ ایک پروفیسر مشتاق احمد زاہدی تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید۔ مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے استادوں میں علّامہ اقبالؒ بھی تھے، جن سے اُن کے مخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم اے کی سند لینے کے بعد مرزا صاحب نے ۷-۱۹۰۶ء میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہوگئے۔ پنجاب کے بیشتر اعلیٰ عہدے دار مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ پطرس[4] اور تاج[5] نے بھی

ا۔ تاجور نجیب آبادی نامور شاعر اور ادبیات کے عالم تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

۲۔ سر سید احمد خاں مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے علم بردار تھے۔ علی گڑھ میں ایم اے او کالج قائم کیا جو ان کی وفات کے بعد یونیورسٹی بن گیا۔

۳۔ منشی ذکاءاللہ، سر سیّد احمد خاں کے قریبی دوست اور ساتھی تھے۔ تحقیق و تصنیف اور تراجم میں نام پیدا کیا۔

۴۔ پطرس بخاری اردو کے معروف اور بلند پایہ مزاح نگار۔ انگریزی ادبیات کے استاد۔

۵۔ سیّد امتیاز علی تاج ادیب اور ڈراما نویس تھے۔ انار کلی ان کا معروف ڈراما ہے۔

مرزا صاحب سے اکتسابِ علم کیا۔ بعد میں پطرس خود انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے، مگر اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی عِلمیّت کے آگے اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مَیں نے بارہا پطرس کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ پطرس کو مَیں نے کسی اور کا اتنا ادب واحترام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ وائسرائے ہند کا بھی۔

پطرس کے سلسلے میں دو ایک دل چسپ واقعات یاد آ گئے۔ پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے تھے، مگر پرانے دوستوں سے رسم و راہ میں ذرا بھی فرق نہ آنے پایا تھا۔ مرزا صاحب کو انھوں نے کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ ریڈیو سے کبھی کبھی تقریر نشر کیا کریں۔ دو ایک تقریروں کے بعد مرزا صاحب نے کانٹریکٹ واپس کرنے شروع کر دیے۔ شُدہ شُدہ بات پطرس تک پہنچی۔ حاضر ہو کر وجہ دریافت کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا: ''تمھیں اِصلاح دینے کے بعد مجھے یہ منظور نہیں کہ تمھارے شاگرد مجھے اِصلاح دیں۔'' پطرس نے بڑی معذرت کی، مگر مرزا صاحب آیندہ نشر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اگلے دن دفتر میں قیامت آ گئی۔ پورے اسٹاف کو جمع کر کے انھوں نے براڈکاسٹنگ کے حُسنِ اخلاق پر ایک طویل لکچر دیا۔ بات تو کھل ہی گئی تھی۔ سٹیشن ڈائریکٹر نے تقریروں کے انچارج کو بلا کر کہا کہ: ''اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو مرزا صاحب کو منا کر لاؤ۔'' اس کو معلوم نہیں تھا کہ مرزا صاحب پطرس کے استاد ہیں۔ حسبِ دستور اپنی کارروائی دکھانے کے لیے اس نے ان کے مسوّدے میں سے دو ایک فقرے نکال دیے تھے۔ ان فقروں کا نکالنا اس کا نوکری سے نکالے جانے کا پیش خیمہ ہو گیا۔ بھاگا مرزا صاحب کی خدمت میں، معافی مانگی، ہاتھ جوڑے، مرزا صاحب نہ مانے، بولا: ''تو حضرت! میری نوکری گئی۔ بال بچے بھوکے مریں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔'' مرزا صاحب کے کان کھڑے ہوئے، بولے: ''یہ تو مَیں نہیں چاہتا۔'' اس نے کہا: ''اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو اس کانٹریکٹ پر دستخط کیجیے۔'' مرزا صاحب نے فوراً دستخط کر دیے۔

جنگ کے زمانے میں حُسنِ اتفاق سے دِلّی میں لاہور کے بیشتر ادیب اور شاعر ریڈیو میں یا دوسرے سرکاری محکموں میں جمع ہو گئے تھے۔ پطرس کی تحریک پر ایک محدود ادبی حلقہ قائم کیا گیا، جس میں ڈاکٹر تاثیرؔ (۱)، فیض احمد فیضؔ (۲)، حامد علی خاں (۳)، حمید احمد خاں (۴)، چراغ حسن حسرتؔ (۵) محمود نظامی (۶)، غلام عباس (۷)، انصار ناصری (۸) وغیرہ شریک کیے گئے تھے۔ ہر مہینے اس کا ایک جلسہ ہوتا تھا، کبھی پطرس کے گھر پر اور کبھی ڈاکٹر تاثیرؔ کے گھر پر۔ اس میں ایک مقالہ کسی ادبی موضوع پر پڑھا جاتا اور اس پر گفتگو

۱۔ ڈاکٹر تاثیر (پورا نام: محمد دین تاثیر) نامور ادیب اور نقاد تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔
۲۔ فیضؔ معروف ترقی پسند شاعر تھے۔ زیادہ تر درس و تدریس اور صحافت سے وابستہ رہے۔
۳۔ حامد علی خاں رسالہ ''الحمرا'' کے بانی ایڈیٹر اور ادیب تھے۔
۴۔ حمید احمد خاں ادیب اور نقاد تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔
۵۔ حسرت صحافی، ادیب اور مزاح نگار تھے۔
۶۔ محمود نظامی ادیب اور براڈکاسٹر تھے۔ نظر نامہ ان کا بلند پایہ سفرنامہ ہے۔
۷۔ غلام عباس کا شمار اردو کے بہت اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔
۸۔ انصار ناصری ادیب اور براڈکاسٹر تھے۔

ہوتی۔ ایک جلسے میں محمود نظامی نے مقالہ پڑھا۔ اس میں مرزا صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ پطرس خاموش رہے۔ مرزا صاحب سے درخواست کی گئی کہ کچھ فرمائیں۔ مرزا صاحب بحث مباحثے کو ناپسند کرتے تھے، اس لیے بڑی محتاط رائے دیتے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہوتا تھا: ''نہیں یہ بات تو نہیں، مگر خیر ایسا بھی ہوتا ہے۔'' پطرس کو شوخی سوجھی۔ فیض کو اشارہ کیا۔ وہ مرزا صاحب سے زیادہ واقف نہیں تھے، بات کاٹ کر فوراً شروع ہوگئے۔ ''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ رومی تہذیب یونانی تہذیب کے بعد اُبھری؟'' اتنا تو ان کا کہنا اور مرزا صاحب کا جلال میں آجانا ''جی ہاں، مَیں یہ جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ............'' پرانی تہذیبوں کی تاریخ کا ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ اس دن مجھے بھی اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کے سینے میں علم کی کتنی دولت بھری پڑی ہے۔ فیض پشیمانی سے بار بار مرزا صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ پطرس دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کہ دیکھا اسے کہتے ہیں علم کا سمندر۔ ہم سب دم بخود ساکت بیٹھے مرزا صاحب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ پطرس نے مرزا صاحب کے جلال کو ختم کرنے کے لیے فوراً چائے کا سامان رکھوانا شروع کردیا اور خدا خدا کرکے مرزا صاحب کا جلال رفع ہوا۔

مرزا صاحب گھنٹوں مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے کُتب خانے میں ہر علم کی کتاب موجود تھی۔ ملازمت درس و تدریس ہی کی تھی، اس لیے نئی سے نئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ''اگر مَیں اتنا مطالعہ نہ کروں تو ان انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں؟'' پنشن لینے کے بعد بھی اُن کا واحد مشغلہ مطالعۂ کُتب ہی رہا۔ ان کا یہ شغل اب تک جاری تھا۔ پنشن کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں صرف کردیتے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی۔ کرّ و فر یا ٹھاٹ باٹ سے کبھی نہیں رہے۔ گھر کی سواری ہم نے ان کے پاس کبھی نہیں دیکھی۔ معدے کے مریض تھے۔ پیدل زیادہ چلتے تھے۔ صبح ٹہلنے ضرور جاتے تھے۔ رات کو جلدی سو جاتے تھے۔ کھیل، تماشے، سینما، تھیٹر کچھ نہیں دیکھتے تھے۔ خدا کے فضل سے گھر کا آرام انھیں میسر تھا۔ اُن کی بیگم بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ دو ایک ناول ان کے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اولاد سعادت مند، بیوی سلیقہ شعار، پنشن اتنی کہ بڑھاپے میں کسی کی محتاج نہیں۔ کھانا سادہ، لباس سادہ، رہن سہن سادہ، پھر احتیاج ہو تو کس بات کی؟ قَلْبِ مُطْمَئِنَّہ کی دولت سے مالا مال تھے۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۲ سال پہلے ایک پروگرام ''دانش کدہ'' شروع کیا گیا تھا، جس میں چار دانش ور بلائے جاتے تھے اور سننے والوں کے سوالوں کے جواب فی البدیہہ دیا کرتے تھے۔ مَیں میرِ سوالات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ مرزا صاحب اگر اس پروگرام میں شرکت فرمانا منظور کرلیں تو اس پروگرام کو چار چاند لگ جائیں چناں چہ مَیں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرضِ مدّعا سن کر متبسّم ہوئے۔ فرمایا: ''آدمی شہرت کے لیے کوئی کام کرتا ہے یا دولت کے لیے۔ مجھے نہ اس کی ضرورت ہے، نہ اُس کی۔'' مَیں نے قدری کرلی، مرزا صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرزا صاحب بہت قاعدے قرینے کے آدمی تھے، جو کہہ دیتے، اس سے نہ پھرتے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب مسلم لیگ نے زور پکڑا تو مرزا صاحب نے سیاست میں بھی حِصّہ لینا شروع کردیا اور صوبائی

مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور مسلم لیگ کاؤنسل کے ممبر بھی چنے گئے۔ کراچی یونی ورسٹی قائم ہوئی تو اس کے مشیر مقرر ہوئے اور جب پاکستانی ادیبوں کا گلڈ ۱۹۵۹ء میں بنایا گیا تو مرزا صاحب ہی نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

مرزا صاحب بظاہر علیل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اِکہرا ڈیل، اُجلا رنگ، کُشادہ پیشانی، گھنی بھنوؤں کے سائے میں بڑی بڑی رَوشن آنکھیں، رُخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، کترواں مونچھیں، ہنستے تو سامنے کے دو چار دانت ٹوٹے ہوئے نظر آتے، مگر بُرے نہ لگتے تھے۔ ڈاڑھی مُنڈی ہوئی۔ دھان پان سے آدمی تھے۔ ۳۰ء میں جب مَیں نے انھیں پہلی دفعہ دیکھا تو ان کی عمر ۴۴-۴۵ سال کی تھی۔ ۶۲ء میں جب وہ ۶۷ سال کے تھے، تب بھی وہ ویسے کے ویسے ہی تھے۔ انھیں زمانے کا شکوہ یا صحت کی شکایت کرتے کبھی نہیں سنا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ سنا ہے کہ دِلّی کے جن دو چار نوجوانوں نے سب سے پہلے سوٹ پہننا شروع کیا، ان میں سب سے نفیس سوٹ مرزا صاحب ہی کا ہوتا تھا، مگر مَیں نے پچھلے ۳۲ سال میں انھیں ہمیشہ شیروانی ہی پہنے دیکھا۔ انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا مگر رعب گانٹھنے کے لیے کبھی انگریزی میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ بالکل نہیں آنے پاتے تھے۔ چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ان کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا، اس لیے لکھنے میں انھیں زحمت ہوتی تھی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج آدمی تھے مگر زیادہ دوست بنانے کے قائل نہیں تھے۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔

موت برحق ہے۔ مرنا سب کو ہے مگر مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے خاصی عمر پائی مگر ان کی وفات کا صدمہ اس لیے زیادہ ہے کہ ایسے قابل، ایسے شریف اور ایسے وضع دار لوگ زمانہ اب پیدا نہیں کرے گا۔ افسوس کہ پروفیسر مرزا محمد سعید اب وہاں ہیں، جہاں ہماری نیک آرزوئیں رہتی ہیں۔ ایسی جامعُ العلوم ہستی سے محروم ہونے کا ہمیں جتنا بھی غم ہو، کم ہے:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!

(گنجینۂ گوہر)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) مرزا محمد سعید کس لیے لکھتے تھے؟

(ب) لاہور کے پبلشروں کے ساتھ مرزا صاحب کا رویّہ کیسا تھا؟

(ج) مرزا صاحب کی معرکتہ الآرا کتاب کا نام اور مرتبہ بیان کیجیے۔

(د) مرزا صاحب کی کن دو قومی شخصیات سے عزیز داری تھی؟

(ہ) مرزا صاحب نے کس کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے؟

(و) مرزا صاحب کا سب سے بڑا مشغلہ کیا تھا؟

(ز) مصنف کے پروگرام 'دانش کدہ' میں شرکت کی درخواست پر مرزا صاحب نے کیا جواب دیا؟

(ح) مرزا محمد سعید کا حلیہ بیان کیجیے۔
(ط) مرزا صاحب کے دونوں ناولوں کے نام تحریر کریں۔

۲۔ پطرس بخاری سے مرزا صاحب کے تعلق کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ ''عالم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔'' اس جملے کا مفہوم وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔

۴۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیے:

(الف) سبق ''مرزا محمد سعید'' کس ادیب کی تحریر ہے؟
(i) نذیر احمد دہلوی (ii) شاہد احمد دہلوی
(iii) اشرف صبوحی (iv) مولوی عبدالحق

(ب) مرزا محمد سعید کی عزیز داری کس شخصیت سے تھی؟
(i) سر سیّد احمد خاں (ii) شیخ عبدالقادر
(iii) شاہد احمد دہلوی (iv) مشتاق احمد زاہدی

(ج) مرزا محمد سعید کے بقول انسان کس لیے کام کرتا ہے؟
(i) شہرت (ii) دولت
(iii) عزت اور وقار (iv) شہرت اور دولت

(د) مرزا محمد سعید نے گورنمنٹ کالج لاہور سے کون سی سند لی؟
(i) بی۔اے (ii) ایم۔اے تاریخ
(iii) ایم۔اے انگریزی ادب (iv) ایم۔اے اردو ادب

(ہ) محمود نظامی کے مقالے کے بعد مرزا محمد سعید پر کس نے تنقید کی؟
(i) ڈاکٹر تاثیر (ii) پطرس بخاری
(iii) فیض احمد فیض (iv) حمید احمد خاں

(و) پروگرام ''دانش کدہ'' میں کتنے دانشور بلائے جاتے تھے؟
(i) چار (ii) تین
(iii) دو (iv) سات

(ز) مرزا صاحب پنشن کا بڑا حصّہ صرف کر دیتے تھے:
(i) جائیداد خریدنے پر (ii) خیرات کرنے میں
(iii) کتابوں پر (iv) کھانے پینے پر

۵۔ درجِ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت جملوں میں استعمال کے ذریعے کیجیے:

سانحۂ ارتحال، سُناوُنی، ایکا ایکی، بےمُزد، متموّل، قرابت داری، ہیچ سمجھنا، شُدہ شُدہ، کرّ وفر، قلبِ مُطمئِنّہ، عرضِ مدّعا، متبسّم، رَعشہ، جامعُ العلوم۔

۶۔ درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر، ان کا تلفظ واضح کیجیے:

ارتحال، شعار، متمول، ساکت، مباحثے، متبسم، قدری، رعشہ

۷۔ سبق ''مرزا محمد سعید'' کا متن ذہن میں رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) مرزا محمد سعید کی موت کی خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ درست/غلط

(ب) مرزا صاحب پبلک پلیٹ فارم پر آنے سے گھبراتے نہیں تھے۔ درست/غلط

(ج) مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ درست/غلط

(د) مرزا صاحب جو کہہ دیتے اس سے کبھی نہ پھرتے۔ درست/غلط

(ہ) مرزا محمد سعید دل کے مریض تھے۔ درست/غلط

جملہ اِسمیہ اور جملہ فعلیہ:

۱۔ جملہ اِسمیہ

جملہ اِسمیہ جملہ خبریہ کی قسم ہے، اس کے تین اجزا ہوتے ہیں۔ ذیل کے جملوں کو پڑھیے:

۱۔ علی بہادر ہے۔

۲۔ سارہ لائق ہے۔

۳۔ صہیب خوش ہے۔

ان جملوں میں علی، سارہ اور صہیب کو ''مُسند الیہ'' (مُبتدا) کہتے ہیں اور بہادر، لائق اور خوش ''مُسند'' (خبر) ہیں جب کہ ''ہے'' فعلِ ناقِص ہے۔

۲۔ جملہ فعلیہ

جملہ فعلیہ بھی جملہ خبریہ کی قسم ہے۔ اس میں اور جملہ اسمیہ میں اتنا فرق ہے کہ جملہ فعلیہ میں فعلِ تام ہوتا ہے۔ اب ذیل کے جملوں کو پڑھیے:

۱۔ حمید نے خط لکھا۔

۲۔ فریحہ نے خیرات دی۔

۳۔ شعیب نے کھانا کھایا۔

ان جملوں میں حمید، فریحہ اور شعیب ''مسند الیہ'' ہیں اور لکھا، دی اور کھایا فعلِ تام یا ''مسند'' ہیں۔ یہ خبر دے رہے ہیں۔
خط، خیرات اور کھانا مفعول ہیں۔
یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ کسی جملے میں کسی کے بارے میں کچھ کہا جائے تو وہ خبر ہوتی ہے اور اسے مسند کہتے ہیں۔
جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ خبر کے بغیر درست نہیں ہوتے۔

خاکہ

کسی شخص کی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کرنا کہ اس کا تعارف بھی ہو جائے مگر وہ اس کی سوانح نہ ہو، خاکہ کہلاتا ہے۔ خاکے میں اس شخص کے افکار و کردار، خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اردو میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور محمد طفیل نے عمدہ خاکے لکھے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ سبق سے محاورات الگ کریں اور ان کو جملوں میں استعمال کریں۔
۲۔ مرزا محمد سعید کی شخصی خوبیوں پر ایک پیراگراف لکھیں۔
۳۔ اس سبق میں جن شخصیات کا ذکر آیا ہے، ان میں سے کسی ایک کے بارے میں استاد سے پوچھ کر نوٹ لکھیں۔
۴۔ کسی دوست کا مختصر خاکہ لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ چند مثالیں دے کر دِلّی کی مخصوص زبان سے طلبہ کو روشناس کرایا جائے۔
۲۔ طلبہ کو مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر ''مولوی نذیر احمد کی کہانی'' اور شاہد احمد دہلوی کا لکھا ہوا خاکہ ''نذیر احمد دہلوی'' پڑھ کر سنایا جائے۔ یہ خاکے نصابی کتابوں میں دستیاب ہیں، اس سے طلبہ کی کردار سازی میں مدد ملتی ہے اور صنفِ ادب سے بھی اچھی طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔
۳۔ طلبہ کو گاہے گاہے مشاہیر سے واقفیت دلائی جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

(۱۹۱۲ء-۲۰۰۵ء)

جبل پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں انجمن اسلامیہ ہائی سکول جبل پور سے نویں جماعت پاس کر کے علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایل ایل بی، ایم اے اردو، ایم اے فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۴۷ء میں پی ایچ ڈی (اردو) کیا۔ ناگ پور یونی ورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز کنگ ایڈورڈ کالج امروتی سے بطور لیکچرار کیا۔ پاکستان بننے کے بعد اردو کالج کراچی سے وابستہ ہوئے۔ سندھ یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے طور پر خدمات انجام دیں۔ انھیں ستارۂ امتیاز، نقوش ایوارڈ، اقبال ایوارڈ اور نشانِ سپاس ملا۔

انھوں نے مذہب، پاکستانیات، ادب، تصوف اور اخلاق جیسے موضوعات پر لکھا۔ ان کی تحریریں زیادہ تر معرّب و مفرّس ہوتی ہیں۔ عام قارئین کے لیے لکھے گئے مضامین و کتب کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ انھوں نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں سو سے زیادہ کتب تصنیف کیں۔ ان کی کتب میں سید حسن غزنوی، حیات اور کارنامے، سراج البیان، اقبال اور قرآن اور تنقید و تحقیق اہم ہیں۔

نظریۂ پاکستان

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو نظریۂ پاکستان کے مفہوم سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو پاکستان کی تشکیل کے مقاصد سے واقفیت دلانا۔

۳۔ طلبہ کو تشکیلِ پاکستان میں حصہ لینے والی اہم شخصیات کے کارناموں سے رُوشناس کرانا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری کو اپنا شیوہ بنایا ہے لیکن جب کفر والحاد غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو مسلمان اس کے مقابلے کے لیے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری اور ملکی سیاست میں ہندوؤں کے عمل دخل کی وجہ سے ملک میں کافرانہ طور طریقے اس قدر رائج ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کی آزادی خود ان کے دینی معاملات میں بھی ختم ہو گئی تھی۔ چناں چہ اکبر کے آخری دور میں اسلام کی سربلندی کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ[1] کھڑے ہوئے۔ آپ نے جہانگیر کے زمانے میں محض دین کی خاطر قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اسلامی قدروں کو نئے سرے سے فروغ دیا۔ ان کے اثر سے شاہ جہاں اور اس کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب، دین کا خادم بنا لیکن اورنگ زیب کے بعد ہی اس کے بیٹوں کے باہمی نفاق اور کمزوری کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ مرہٹوں اور ہندوؤں کے کئی گروہوں نے سر اٹھایا۔ انگریزوں نے اپنے قدم جمائے اور ملک میں انتشار پھیل گیا لیکن ایسے گئے گزرے حالات میں بھی قوم کو فروغ دینے اور اسلام کو سربلند کرنے کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ چنانچہ میسور کے سلطان حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں کا مقابلہ کیا بلکہ افغانستان، ترکی اور پھر فرانس کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی لیکن ملک کے دوسرے سرداروں نے ساتھ نہیں دیا اور انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ[2] اور ان کے صاحبزادوں نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی تحریک شروع کی۔ پھر ان کے پوتے شاہ اسمٰعیلؒ نے اپنے مرشد سید احمد بریلویؒ کے ساتھ اسلامی اصولوں کو دوبارہ رائج کرنے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش میں ۱۸۳۱ء میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تاہم انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے پھر اپنے قدم جمانے کی کوشش کی لیکن انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اس لیے انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں سرسید نے مجبوراً انگریزوں سے مفاہمت کو غنیمت جانا اور مسلمان

۱۔ مجدد الف ثانی (۱۵۶۴ء۔۱۶۲۴ء) نقشبندی سلسلے کی اہم شخصیت

۲۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۳ء) عالم دین، محدث، مصلح

قوم کی اخلاقی اور تہذیبی اصلاح پر توجہ دی اور ان کے دلوں سے احساسِ کمتری کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوؤں نے کانگریس کی بنیاد ڈالی اور ظاہر یہ کیا کہ وہ ملک کی تمام قوموں کو ان کے حقوق دلوائیں گے لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ صرف اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے کاروبار سے محروم کرنے کی کوشش کی اور وہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہوگئے۔ نیز انھوں نے مسلمانوں کی مشترکہ زبان اردو کے مقابلے میں ہندی کو قائم کر دیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی کانگریس اور ان کی سیاست سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور ان کے ایک دوست مولانا محمد قاسمؒ نے دیوبند میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ پھر سرسید کے ایک رفیق نواب وقارالملک نے ۱۹۰۶ء میں کُل ہند مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ تنظیم ڈھاکے میں قائم ہوئی تھی، جہاں ہندوؤں نے سازش کرکے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے مشرقی بنگال اور آسام کا وہ صوبہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ختم کرا دیا۔ ۱۹۱۱ء میں اسی علاقے کو پھر بنگال میں شامل کرا دیا۔

اسی زمانے میں پہلی جنگِ عظیم ① چھڑ گئی جس میں انگریز کا مقابلہ جرمنی سے ہوا اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان چوں کہ ترکی کے سلطان کو حجاز کی خدمت کرنے کی وجہ سے خلیفۂ اسلام سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے مالی اور طبی امداد بہم پہنچائی، جس کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ کو مسلمانوں سے عناد پیدا ہوگیا لیکن اُنھوں نے یہاں کے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ اگر ہم کو اس جنگ میں فتح حاصل ہوگی تو ہم کسی طرح بھی ترکی کو مزید نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہ وعدہ محض فریب تھا، چناں چہ جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تو وہ اپنے وعدے سے پھر گئے اور اُنھوں نے ترکی ② کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہاں کے مسلمانوں کو اس فریب کی وجہ سے بہت تکلیف پہنچی اور اُنھوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے مولانا محمد علی جوہرؒ اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علیؒ کی رہنمائی میں تحریکِ خلافت شروع کی۔ اس زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے شُدّھی کی تحریک شروع کی اور ان کو ختم کرنے کے لیے سنگھٹن کی تحریک بھی شروع کی پھر ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے جو نہرو رپورٹ شائع کی، اس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمایندگی کا اصول، جو وہ بارہ سال پہلے تسلیم کر چکی تھی، بالکل نظر انداز کر دیا۔ پھر تو مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا اور انھیں یقین ہوگیا کہ چوں کہ ان کا دین، ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت سب کچھ غیر مسلموں سے مختلف ہے، اس لیے کسی حالت میں ہندوؤں سے تعاون نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد والے اجلاس میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن (پاکستان) بنانے کی تجویز پیش کی۔ چار سال کے بعد جب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی صدارت کا مستقل طور پر عہدہ قبول کیا تو اُنھوں نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کر دی۔ آخر کار ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو انھوں نے لاہور کے اجلاس میں واضح طور پر اعلان کر دیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی

۱۔ جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں ختم ہوئی)

۲۔ مراد خلافتِ عثمانیہ ہے

اکثریت ہے، وہاں ایک آزاد مسلم ریاست قائم کی جائے۔ اس اعلان کو ''قراردادِ پاکستان'' کہتے ہیں، جس کی رُو سے مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا میں قومیت کی تشکیل کی دو بنیادیں ہیں: ایک وہ جو مغربی مفکرین نے قائم کی ہے۔ دوسری وہ جو رسولِ مقبول صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قائم کی ہوئی ہے۔ اہلِ مغرب نے خاندانی، نسلی اور قبائلی بنیادوں میں ذرا وسعت پیدا کر کے قومیت کی بنیادیں جغرافیائی حدود پر استوار کیں اور کہا کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس نظریے کی وجہ سے دنیا کے انسانوں کے درمیان تباہی کا جو دروازہ کھلا، وہ دو عالمی جنگوں کے ہونے سے بخوبی ظاہر ہے۔ یہ وطنی قومیت ہی کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور یہ وطنی قومیت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو تحفظ دینے میں تو بالکل ہی ناکام تھی، کیوں کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان اس نظریے کے تحت ایک مجبور اقلیت بن جاتے۔

قومیت کی دوسری بنیاد وہ ہے جو رسولِ مقبول صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ملتِ اسلامیہ کی تشکیل کرتے وقت قائم فرمائی اور جو مغرب کے تصورِ قومیت سے جدا ہے، جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے بھی فرمایا ہے:

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری

مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے جو لا الٰہ الا اللّٰہ پر قائم ہے، یعنی یہ کہ نسل، رنگ اور وطن کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک نظریے، ایک عقیدے، ایک کلمے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور اس نظریاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے اسے ملّت کہا گیا ہے۔ ایسی نظریاتی قومیت میں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر جغرافیائی خطّے کے لوگوں کے لیے جگہ ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو، جن میں ہر نسل، ہر رنگ اور مختلف جغرافیائی خطّوں کے لوگ شامل تھے، ایک ایسی قوم کے ماتحت اقلیت بن کر رہنا منظور نہ تھا جو اسلامی قومیت کے برعکس ذات پات، چھوت چھات اور بت پرستی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنی جداگانہ قومیت یعنی اسلامی قومیت کی بنیاد پر اپنے لیے ایک جدا وطن کا مطالبہ کیا، جس میں وہ اپنے عقیدے، اپنے نظریۂ زندگی، اپنے طرزِ معاشرت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے دورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔

ہمیں اس بات کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نظریۂ پاکستان میں اسلامی زندگی اور قدروں کا تصور بنیادی

حیثیت رکھتا ہے۔ اخوت، مساوات، عدل، دیانت، خداترسی، انسانی ہمدردی اور عظمتِ کردار کے بغیر نظریۂ پاکستان کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ نظریۂ پاکستان کا مقصد محض ایک حکومت قائم کرنا نہیں تھا کیوں کہ مسلمانوں کی حکومتیں ایشیا اور افریقہ میں پہلے سے موجود تھیں۔ نظریۂ پاکستان کا مقصد اسلامی اصولوں کی ترویج واشاعت اور اہلِ عالم کے لیے مثالی مملکت کا نمونہ فراہم کرنا ہے۔

پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہندوؤں کو بہت ناگوار گزرا۔ اُنھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ مملکت قائم نہ ہونے پائے۔ ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ جنوبی ایشیا میں ان کی اکثریت تھی لیکن چوں کہ قیامِ پاکستان کا مطالبہ حق اور انصاف پر مبنی تھا اس لیے حکومتِ برطانیہ کو مجبور ہونا پڑا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی پُرخلوص قیادت، مسلمانوں کے یقین، اتحاد اور عملِ پیہم کی وجہ سے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

پاکستان نے اپنے قیام سے اب تک بڑی ترقی کی ہے اور اس کا شمار دنیا کے اہم ملکوں میں ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان اور زیادہ ترقی کرے اور ہمیشہ ترقی کرے تو ہمیں نظریۂ پاکستان کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔ اس کی بدولت ہم پاکستان کو زیادہ مستحکم اور شان دار بنا سکتے ہیں۔

نظریۂ پاکستان کا مقصد پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بنانا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہیے، جس کی وجہ سے خُدا اور اس کے رسول صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ ہمارا جینا اور مرنا پاکستان کے لیے ہونا چاہیے۔ قومی مفاد کے سامنے ذاتی مفاد کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ ہر قسم کی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر تمام پاکستانیوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنا نظریۂ پاکستان کو فروغ دینا ہے۔ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان کو پیشِ نظر رکھا اور اپنی سیرت اور کردار کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تو دنیا کی دوسری قوموں میں بھی ہمیں امتیاز حاصل ہوگا اور ہم اسلامی اُصولوں کی روشنی میں پاکستان کو توانا، مستحکم، شان دار اور پُرعظمت بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوں گے، اِن شاءاللّٰہ۔

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) مسلمانوں کو اپنے دینی معاملات میں اپنی آزادی کب ختم ہوتی نظر آئی؟

(ب) سلطان ٹیپو اپنی جدوجہد میں کیوں کامیاب نہ ہوسکا؟

(ج) تحریکِ خلافت کیوں شروع کی گئی؟

(د) علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کب اور کہاں کیا؟

(ہ) اہلِ مغرب نے قومیت کی بنیاد کس پر رکھی ہے؟
(د) مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کیا ہے؟
(ز) نظریۂ پاکستان کا مقصد کیا ہے؟
(ح) شُدّھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے مقاصد کیا تھے؟

۲۔ درجِ ذیل الفاظ و مرکّبات کو جملوں میں استعمال کریں:

کفر و الحاد، نفاق، ولولہ، مستحکم، زک، خودمختار، جمعیّت، اخوت، عملِ پیہم، فلاح و بہبود

۳۔ سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۴۔ سبق کے متن کے پیشِ نظر درجِ ذیل میں سے درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(i) ڈاکٹر سید عبداللہ (ii) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (iii) سر سید احمد خاں (iv) جمیل الدین عالی

(ب) اکبر کے دور میں دین کی سربلندی کے لیے کس نے سختیاں جھیلیں؟

(i) حضرت مجدد الف ثانیؒ (ii) شاہ ولی اللہؒ (iii) سید احمد بریلویؒ (iv) شاہ اسمٰعیلؒ شہید

(ج) سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کب شہید ہوئے؟

(i) ۱۸۲۱ء میں (ii) ۱۸۳۱ء میں (iii) ۱۸۴۱ء میں (iv) ۱۸۵۷ء میں

(د) کانگریس کب قائم ہوئی؟

(i) ۱۸۸۵ء میں (ii) ۱۸۸۶ء میں (iii) ۱۸۹۵ء میں (iv) ۱۹۰۶ء میں

(ہ) مسلم لیگ کس نے قائم کی؟

(i) سر سید احمد خاں (ii) نواب محسن الملک (iii) قائدِ اعظمؒ (iv) نواب وقار الملک

(و) مصنف نے دنیا میں قومیت کی تشکیل کی کتنی بنیادیں بتائی ہیں؟

(i) ایک (ii) دو (iii) چار (iv) آٹھ

۵۔ سبق کے متن کو ذہن میں رکھ کر درست اور غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) مسلمان کفر و الحاد کا غلبہ ہوتے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ درست/غلط
(ب) شاہ اسمٰعیلؒ، سید احمد بریلویؒ کے مرشد تھے۔ درست/غلط

(ج) سرسید نے مجبوراً انگریزوں سے مفاہمت کو غنیمت جانا۔ درست/غلط

(د) پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے انگریز کا ساتھ دیا۔ درست/غلط

(ہ) ترکی کو نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ فریب ثابت ہوا۔ درست/غلط

(و) مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مغرب کے تصورِ قومیت سے مختلف ہے۔ درست/غلط

۶۔ کالم (الف) کا ربط کالم (ب) سے کیجیے:

کالم (الف)	کالم (ب)
۱۹۳۰ء	شہادت شاہ اسمٰعیلؒ
کانگریس	اسلامی زندگی
مسلم لیگ	الہ آباد
۱۸۳۱ء	۱۸۸۵ء
نظریۂ پاکستان	۱۹۰۶ء

۷۔ سبق میں مذکور شخصیات میں سے کسی ایک شخصیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔

☆☆☆

سرگرمیاں

۱۔ مشاہیرِ تحریکِ پاکستان کا تصویری چارٹ بنا کر جماعت کے کمرے میں آویزاں کریں۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے مقاصد کی ایک فہرست بنائیں اور جماعت کے کمرے میں دیگر طلبہ کو سنائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ پر دو قومی نظریے کا پس منظر واضح کیا جائے۔

۲۔ تحریکِ پاکستان کے قائدین کے کارناموں سے طلبہ کو مطلع کریں۔

۳۔ قومیت کی بنیادیں کیا ہوتی ہیں، طلبہ کو آگاہ کریں۔

۴۔ تشکیلِ پاکستان میں طلبہ کے کردار سے اپنے طلبہ کو آگاہ کریں۔

☆☆☆

اشرف صبوحی

(۱۹۰۵ء-۱۹۹۰ء)

اشرف صبوحی کا اصل نام سیّد ولی اشرف اور قلمی نام اشرف صبوحی تھا۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں اینگلو عریبک ہائی سکول دہلی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ معروف ادیب شاہد احمد دہلوی ان کے ہم جماعت تھے۔ اشرف صبوحی محکمہ ڈاک و تار میں ملازم رہے۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ملازمت سے سَبُک دوش ہو گئے اور ہمدرد دواخانہ کے شعبہ مطبوعات سے وابستگی اختیار کر لی۔

اشرف صبوحی ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ اردو زبان خصوصاً دہلی کے مختلف طبقوں کی بول چال اور وہاں کے روزمرہ اور محاورے پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیوں کی درجن بھر کتابیں بھی لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

ان کی تصانیف میں دِلّی کی چند عجیب ہستیاں ، غبارِ کارواں ، جھروکے ، سلمٰی اور بن باسی دیوی شامل ہیں۔ اشرف صبوحی نے چند انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

پرستان کی شہزادی

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو اردو کی معروف داستانوں اور اُن کے مصنّفین سے رُوشناس کرانا۔
۲۔ دہلی کے روزمرّہ اور محاوروں سے مُزیّن ایک نثر پارے کے ذریعے سے طلبہ کی لسانی صلاحیت میں اضافہ کرنا۔
۳۔ اشرف صبوحی کے دل کش اسلوب سے آگاہ کرنا۔
۴۔ طلبہ کو ذُو معنی الفاظ اور تشبیہ سے روشناس کرنا۔

سیّدانی بی کا ایک وقت میں بڑا دور دورہ تھا۔ قلعے کی اچھی اچھی مُغلانیاں ان کے سامنے کان پکڑتی تھیں۔ محلّات میں جہاں کوئی نیا جوڑا اِسلا، کسی نئی وضع کی ٹِکائی کا ذکر ہوا اور یہ بلائی گئیں۔ شہر کی بیگمات میں بھی ان کے ہُنر کی دھاک تھی۔ سب انھیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج پالکی چلی آ رہی ہے کہ بڑی سرکار نے بلایا ہے۔ کل ڈولی کھڑی ہوئی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے یاد کیا ہے۔ نہ رات کو فُرصت تھی نہ دن کو چَین۔ صبح کہیں مہمان ہیں تو شام کو کہیں، لیکن رہے نام سائیں کا۔ بڑھاپا آیا، تو ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ اب کون پوچھتا؟ دنیا اور مطلب۔ مطلب نہ رہا، تو کیسی خاطر داری؟ ہارے وقت کا کوئی ساتھی نہیں۔ بے چاری کو ٹکڑے کا سہارا دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ جب بہت پریشان ہوئیں تو پڑوس میں ایک میر صاحب رہتے تھے، ان کی بیوی نے انھیں ترس کھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

سنا ہے کہ یہ نہایت شریف گھرانے کی بیٹی تھیں۔ مرہٹہ گردی میں ان کا خاندان تباہ ہو گیا۔ برس دن کی بیاہی بیوہ ہو گئیں۔ اس زمانے میں دوسری شادی کرنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ مُغلانی کا پیشہ اختیار کر لیا اور اپنی ہنرمندی کی بدولت رنڈاپا گزار دیا۔ جوانی تو عزّت آبرو سے کٹ گئی، خوب کمایا، ہزاروں روپے اِنعام میں لیے، مگر رکھنا نہ جانا۔ دل کی حاتم اور طبیعت کی نرم تھیں اور پرانے شریفوں میں ایک یہی عیب ہوتا ہے کہ وہ وقت کی قدر نہیں کرتے۔ خدا کی بے نیازی کو بھول جاتے ہیں۔ بنے ہوئے زمانے میں بگڑنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ جانتے ہیں کہ یہی لہر بہر رہے گی۔ سیّدانی بی بھی جوانی بھر اس غلط فہمی کا شکار رہیں۔ بُڑھاپے نے آن دبایا۔ طاقتیں دغا دے گئیں، تو آنکھیں کُھلیں اور دوسروں کے سہارے پر زندگی کے اندھیرے دن پُورے کرنے پڑے۔

میر صاحب کے گھر والے چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کے سب انتہا سے زیادہ خوش مزاج اور خدا ترس تھے۔ ہر ایک سیّدانی بی کو خدا کا بھیجا ہوا مہمان سمجھ کر ان کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ سیّدانی بی دو چار دن تو ذرا غمگین اور شرمندہ شرمندہ سی رہیں،

پھران کا بھی دل کھل گیا اوراس طرح رہنے لگیں جیسے اپنے کنبے میں۔ ہاتھ کانپتے تھے، نگاہ موٹی ہوگئی تھی، سُوئی کا ناکا مشکل سے سوجھتا تھا لیکن ساری عمر محنت کرکے کھایا تھا۔ پرائی روٹی مفت کیسے کھاسکتی تھیں؟ صبح نماز پڑھ کر بچوں کو لے بیٹھتیں۔ قرآن شریف پڑھاتیں، نصیحتیں کیا کرتیں۔ دوپہر کو سینا، پرونا اور کاڑھنا سکھاتیں۔ شام ہوتی تو باورچی خانے میں جاکر کھانا پکانے کی ترکیبیں بتاتیں۔ عشا کی نماز سے فارغ ہوکر بڑے مزے کی کہانیاں سناتیں۔ کہانیاں ایسی اچھی ہوتیں کہ بڑے بھی آجاتے۔ میر صاحب اور ان کی بیوی، دونوں خوش تھے کہ سیّدانی بی کو بچوں کی تربیت کے لیے خدا نے بھیج دیا۔ ایسی شریف، نماز روزہ کی پابند، ہنرمند استانی صرف روٹیوں پر کہاں میسر آتی ہے؟ بچے ایسے گرویدہ ہوئے کہ دن رات سیّدانی بی کے پاس بیٹھے رہتے۔

مشہور تھا کہ سیّدانی بی پرستان میں بھی ہو آئی ہیں۔ وہاں کے بادشاہ نے انھیں اپنی بیٹی کا جہیز ٹانکنے کے لیے بلایا تھا اور انھوں نے وہاں کئی دن رہ کر بڑے بڑے تماشے دیکھے ہیں۔ گھر والوں کو یہ خبر تھی، لیکن کبھی خیال نہیں آیا کہ سیّدانی بی سے پوچھتے تو، کیا بی، سچ مُچ تم پرستان گئی ہو؟ شاباش! تمھارا جگرا، تم کو ڈر نہیں لگا؟

ایک دن سردیوں کی رات تھی۔ دالانوں کے پردے پڑے ہوئے تھے، چھوٹے بچے لحافوں میں دُبکے اور بڑے لڑکے، لڑکیاں انگیٹھی کے چاروں طرف بیٹھے کہانی سن رہے تھے، اتنے میں میر صاحب کی بیوی نماز وظیفے سے فارغ ہوکر آئیں۔ اتفاق سے کہانی بھی انڈا شہزادی کی تھی۔ جب یہ ذکر آیا کہ کانڑے دیو کی جو شہزادی پر نظر پڑی تو سوتی کو پلنگ سمیت اُڑا کر لے گیا، کہنے لگیں: ''سیّدانی بی! یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تمھیں بھی پرستان کے بادشاہ کا کوئی آدمی پرستان لے گیا تھا اور تم وہاں سے بڑا اِنعام واکرام لائی تھیں، کیا یہ سچ ہے؟''

سیّدانی: ''ہاں بیوی، ہے تو سچ، بلکہ کئی دفعہ جنوں اور پریوں نے مجھے بلایا ہے۔''

میر صاحب کی بیوی: ''اُوئی! اور تم بے دھڑک چلی گئیں؟''

سیّدانی: ''پہلی دفعہ تو مجھے دھوکے سے لے گئے تھے۔ راستے میں جب بھید کھلا تو بہتیری ڈری، لیکن کیا کرتی، دل کو مضبوط کرلیا۔ اللہ کو یاد کرتی ہوئی چلی گئی۔ نہ جاتی یا روتی پیٹتی تو جانے کیا آفت آتی۔ اس کے بعد جب گئی، ہنسی خوشی گئی اور ہنسی خوشی آئی۔ بیگم! صدقے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے، اس پر ایمان رکھنے والے کا کہیں بال بیکا نہیں ہوا۔ پرستان میں بھی میری وہ خاطریں ہوئیں کہ کیا کہوں۔''

میر صاحب کی بیوی: ''کچھ بھی سہی بوا۔ میرا تو پِتّا پھٹ جاتا۔ صورت دیکھتے ہی جان نکل جاتی۔''

سیّدانی: ''نہیں بی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ڈر کی باتوں سے ڈر لگا کرتا ہے۔ جہاں ڈر سامنے آیا پھر کچھ بھی نہیں۔ دیکھو، بیماری سے لوگ کتنا بھاگتے ہیں اور جب بڑے سے بڑا دکھ بھی آجاتا ہے تو سہنا ہی پڑتا ہے۔''

میر صاحب کی بیوی: ''مَیں تو پھر کہوں گی کہ تم کو شاباش ہے۔ صدرحمت اس پر جس نے تمھیں دودھ پلایا۔ اچھا ہمیں بھی

تو سناؤ کہ کیا ہوا تھا۔ کیوں گئی تھیں؟ پرستان کیسا ملک ہے؟ وہاں کیا کیا دیکھا؟''

سیّدانی: ''وہ قصہ یاد آتا ہے، تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرستان کی شہزادی جس کے جوڑے ٹانکنے گئی تھی، بہت سر ہوئی۔ دوسری پریوں نے بھی منتیں کیں کہ سیّدانی اماں، یہیں رہ جاؤ۔ دنیا میں اب تمھارا کون ہے؟ مگر مَیں نے ایک نہ مانی۔ مجھ بدنصیب کو تو اپنے جیسے انسانوں کی بے مُرَوّتیاں دیکھنی تھیں، پرستان میں کیوں بستی؟ وہ تو اللہ نے تمھارے دل میں رحم ڈال دیا جو گور گڑھے کا ٹھکانا ہو گیا، ورنہ تیرے میرے دروں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔''

میر صاحب کی بیوی: ''سیّدانی بی! سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بندے میں کیا طاقت ہے کہ بھوکے کو دے یا پیٹ بھرے سے چھینے؟ ہر ایک اپنی تقدیر کا کھاتا ہے۔ ہماری کیا اصل کہ کسی کے ساتھ سلوک کریں۔ وہ زبردستی ہم سے تمھاری خدمت کرا رہا ہے۔''

سیّدانی: ''خیر، اب تم کو اپنی بیتی کہانی سناؤں۔ بیگم یہ وہ دن تھے کہ نواب اعظم الدّولہ بہادُر کی اکلوتی بیٹی کے بیاہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ مارا مار جوڑے سِل رہے تھے۔ اوّل اوّل تو مجھے رات دن وہیں رہنا پڑا۔ کام ہلکا ہو گیا تو دن کو چلی جاتی اور شام کو اپنے گھر چلی آتی۔ ایک روز جیسے بچے مکتب سے بھاگتے ہیں، میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہا اور کئی جگہ سے بُلاوے آئے، نہ گئی۔ شاید جمعہ تھا۔ کتنے ہی دن نہائے کو ہو گئے تھے۔ خوب نہائی، شام ہو گئی۔ بونٹ پلاؤ مجھے خوب بھاتا ہے۔ ماما سے بونٹ پلاؤ پکوایا۔ تھکی تھکائی لیٹی تھی۔ اتنے میں جُھٹ پٹا ہو گیا۔ پلاؤ دم پر تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی: ''سیّدانی بی کو سرکار نے یاد کیا ہے۔ پینس بھیجی ہے، جس طرح بیٹھی ہو، اسی طرح فوراً چلی آؤ۔''

مَیں بڑے نخروں سے جایا کرتی تھی۔ ایسے بے وقت اور اپنے بھاؤن کی پکوائی ہوئی چیز چھوڑ کر کھڑے ہو جانا میری عادت کے بالکل خلاف تھا، لیکن ہونے والی بات، مَیں نے ذرا انکار نہ کیا اور جیسی بیٹھی تھی، سفید چادر سر پر ڈال، سوار ہو گئی۔

نواب صاحب کا محل میرے گھر سے کوئی دو آنے ڈولی ہو گا۔ قاضی واڑے سے نکلے اور خانم کا بازار آیا۔ پہلے تو مجھے کچھ خیال نہ ہوا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور ہٹو بچو کی آواز نہ آئی، بازار کے چراغ بھی جھلکتے ہوئے دکھائی نہ دیے، تو پردے کی جھری کھولی۔ اب جو دیکھتی ہوں، تو جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے اور پینس کو جیسے پہیے لگے ہوئے ہیں، اُڑی چلی جا رہی ہے۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ بدن میں سنسنیاں آنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے کہ یہ کیا غضب ہوا۔ یہ موئے کہار کہاں لیے جاتے ہیں؟ اس جنگل میں کون سی سرکار ہے؟ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، دل کڑا کر کے مَیں نے اپنی آواز نکالی اور پوچھا: ''اے کم بختو! منہ سے تو پھوٹو، مجھے کہاں لے جاؤ گے؟ ارے وہ تمھاری کون سی ستیاناسی سرکار ہے؟''

ہنستے ہوئے کسی نے جواب دیا: ''سیّدانی بی، خفا کیوں ہوتی ہو۔ بادشاہ سلامت نے بلایا ہے، کوئی دم میں محلّات دکھائی دیتے ہیں۔''

ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی پالکی کے پاس بول رہا ہے۔ منہ نکال کر جو دیکھا تو بیگم کیا کہوں، ایک بے جا کی شکل کا آدمی تھا۔ بکرے کا سا منہ، گھوڑے کی سی ٹانگیں اور پالکی آپ ہی آپ چلی جاتی تھی۔ نہ کہار تھے نہ کہاریاں۔ اب تو ڈر کے مارے میرا دم گھُٹنے لگا۔ آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگی۔ ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ منٹ دو منٹ کے بعد پھر ہمّت کی کہ اوّل مرنا، آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا اور للکار کر بولی: ''ارے جواں مرگ، تو کون ہے جن یا بھُوت؟ یاد رکھ مَیں سیّدانی ہوں۔ مجھ کو بتا، نہیں تو جل کر راکھ ہو جائے گا۔ بھلا چاہتا ہے تو مجھے یہیں اُتار دے۔''

اس نے کہا: ''سیّدانی بی! گھبراؤ نہیں۔ ہم اور ہمارا بادشاہ سیّدوں کو بہت مانتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو، کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہماری شہزادی کی شادی ہے۔ کپڑے سی کر چلی آنا۔ جتنا مانگوگی، اِنعام ملے گا۔ لو دیکھو، وہ سامنے ہمارے بادشاہ کا محل ہے۔''

بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، تو واقعی پالکی ایک عالی شان دروازے پر رکھی تھی۔ روشنی ایسی تھی کہ دن معلوم ہوتا تھا۔ سُوئی، گر پڑے، تو اُٹھا لو اور مزہ یہ کہ سورج تھا نہ چاند، نہ فانوس کہیں نظر آتے تھے نہ لالٹین۔ چوب دار، باری دار مرد ہیں، اِدھر کے اُدھر، اُدھر کے اِدھر دوڑ رہے تھے۔ آسمان پر سے عجب عجب طرح کے باجوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ تماشا دیکھ کر مَیں ساری مصیبت بھول گئی۔ مَیں حیران تھی کہ یہ کس بادشاہ کا محل ہے؟ یہ گہما گہمی تو ہمارے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں ہوتی۔ قصّے کہانیوں میں جیسی پریوں کا ذکر سنا ہے، ایسی ایک پری، شانوں پر بال بکھرے ہوئے، بازوؤں پر پَر، میرے پاس آئی اور مہین آواز میں بولی: ''سیّدانی بی، بڑی راہ دکھائی۔ ہمارے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ آؤ چلو مَیں تم کو محل کے اندر لے چلوں۔''

مَیں پالکی سے اتری اور چادر کو اچھی طرح اَوڑھ اس پری کے ساتھ ساتھ چلی۔ کیا کہوں، اندر کیا بہار تھی۔ ہزاروں پریاں گورے گورے رنگ، بُوٹا سا قد، زرق برق کپڑے، ہنستی، چُہلیں کرتی اَہلی گہلی پھر رہی تھیں۔ چمن ایسا کہ نہ دیکھا نہ سنا۔ ہر درخت کا تنا چاندی کا، سونے کی شاخیں زُمُرّ د کے پتّے، پھلوں کی جگہ کہیں لعل لٹک رہے تھے، کہیں نیلم، کہیں پکھراج۔ پھولوں پر یہ عالَم تھا جیسے ہیرے چمک رہے ہوں۔ کلیاں تھیں کہ صُراحی دار موتی۔ خوش بُو سے دماغ مہکا جاتا تھا۔ حوضوں کا پانی اللّٰہ اللّٰہ! چاندی کے وَرق بکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ فوّاروں میں سے موتیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

چلتے چلتے ایک بارہ دری میں پہنچے۔ بارہ دری کی سجاوٹ کیا بیان کروں۔ قلعے کے دربار بھی دیکھے ہیں، مگر اُس جیسا سماں آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ سیکڑوں سرخ، سبز، نیلی، زرد، اُودی، سفید کرسیاں بچھی تھیں۔ رنگ برنگ کے بلور کی تھیں یا کسی اور چیز کی، ایسی شفاف کہ آر پار نگاہ گزر جاتی تھی اور اُن پر حسین حسین پری زاد جگمگاتے لباس پہنے بڑے ٹُھسّے سے بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک نمگیرے کے نیچے ایک بڑے یاقوت کے تخت پر، جس میں ہیرے اور پنّے کی پچّی کاری کا کام تھا، بادشاہ اور بادشاہ بیگم عجیب شان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ بیگم کے پہلو میں ایک لڑکی کوئی چودہ پندرہ برس کی، چہرہ جیسے چودھویں رات کا چاند، زُلفیں کھلی ہوئی،

کئی رنگ کے پَر اور ایسے چمک دار کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی، سر پر نیم تاج رکھے بیٹھی تھی اور تینوں کی پوشاکیں ایک رنگ کی ہوں، تو بتاؤں۔ گھڑی میں چار چار رنگ بدلتی تھیں۔

مَیں آگے تو بڑھ رہی تھی، مگر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ڈر سے نہیں، حیرانی سے کہ یااللہ، یہ کون لوگ ہیں! مَیں جاگ رہی ہوں یا خواب میں یہ پرستان کی سیر ہے، اور اگر جاگتے میں کوئی پری یا دیو مجھے یہاں اُڑا لایا ہے، تو دیکھیے گھر اُلٹا جانا بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اسی سوچ میں تخت کے پاس پہنچ گئی۔ بادشاہ میری گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے اور بادشاہ بیگم نے مجھ سے کہا: ''آؤ! سیّدانی بی آؤ! مزاج تو اچھا ہے؟ مَیں نے سنا ہے کہ راستے میں تم بہت ڈریں۔''

مَیں بولی: ''حضور کو دعا دیتی ہوں اور حضور ڈرنا کیسا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے مدد کی۔ نہیں تو جان نکلنے میں کسر ہی کیا رہی تھی۔'' صدقے مولا کے نام پر۔ بادشاہ اور سارے درباری سروقد کھڑے ہوگئے اور بادشاہ فرمانے لگے: ''سیّدانی بی! تم جانتی ہو، ہمارے ہاں اس نام کی کتنی عزّت ہے۔''

مَیں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جو کچھ بھی ہو، یہ لوگ ہیں مسلمان اور اب کسی بات کا ڈر نہیں۔

بادشاہ بیگم: ''ہم کو گنہگار نہ کرو، ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولیں: بیٹھ جاؤ۔ ہاں تم ڈری کیوں تھیں؟''

مَیں نے کہا: ''سرکار، ڈرنے کی بات کیوں نہ تھی؟ ایک اکیلی، دوسرے سُنسان جنگل، پھر جو میرے ساتھ تھا، اس کی صورت ایسی ڈراونی تھی کہ میرے اوسان جاتے رہے۔''

یہ سن کر شہزادی خوب ہنسی اور بولی: ''اماں بیگم، بکر گدھا مُوا بڑا شریر ہے۔ اس نے کہیں اپنی شکل دکھا دی ہوگی۔'' اب میرے پیٹ میں پھر ہول اٹھنے لگے کہ کہیں یہ ساری صورتیں بھی نقلی نہ ہوں اور بَولا بَولا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

بادشاہ بیگم سمجھ گئیں کہ شہزادی کی باتوں سے سیّدانی کے دل میں ہماری صورتوں کی طرف سے کچھ شُبہ ہوگیا ہے۔ وہ مسکرا کر بولیں:

''سیّدانی بی! ڈرو نہیں، ہماری سب کی شکلیں اصلی ہیں، بلکہ پری زادوں کی ساری ایسی ہی خوب صورت شکلیں ہیں جیسی تم دیکھ رہی ہو۔ میری لڑکی سہیل پری نے جس کا ذکر کیا، وہ جن ہے اور جن البتہ وضع وضع کی شکلوں کے ہوتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو، تمھارے سامنے کوئی جن یا دیو بُری صورت بنا کر نہیں آئے گا۔''

اتنے میں کھانوں کے خوان اُترنے لگے۔ خاصہ چُنا گیا۔ کھانا کیا تھا، اللہ کی قدرت کا کرشمہ۔ ایک ایک بالشت کے پودے پھلوں، پھولوں سے لدے ہوئے سامنے تھے۔ خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں، مگر مَیں کھاتی کیا؟ نہ کسی قسم کی روٹی تھی نہ سالن، نہ پلاؤ تھا نہ زردہ۔ ہکّا بکّا ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھی کہ بادشاہ بیگم مسکرا کر بولیں: ''سیّدانی بی! دیکھتی کیا ہو، کھاتی کیوں نہیں؟ یہ پرستان کا کھانا ہے۔ تم مہمان ہو، ہاتھ بڑھاؤ تو اور بھی کھائیں۔'' مَیں نے کہا: ''سرکار کوئی کھانے کی چیز ہو تو کھاؤں، یہ تو نگوڑے

درخت ہیں اوران میں جو پھل پُھول لگے ہیں، وہ بھی اللہ مارے سچ مچ کے نہیں دکھائی دیتے۔'' شہزادی الھڑ نے میرے اس کہنے پر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور کہنے لگی: ''سیّدانی بی! جیسا سُنا تھا کہ آدم زاد بڑا بھولا ہوتا ہے، تمھیں ویسا ہی پایا۔ تم بسم اللہ کرکے کوئی پھل توڑو اور کھاؤ تو جس کھانے کا دل میں خیال کروگی، وہی مزہ آئے گا۔''

''بیگم یقین مانو ایک زرد زرد جو پھل توڑ کر مَیں نے منہ میں رکھا، کیا کہوں دِلّی میں تو کسی نے ایسے ذائقے کا بونٹ پلاؤ کھایا نہ ہوگا۔''

میر صاحب کی بیوی: ''بونٹ پلاؤ جو گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں وہی پہلے یاد آیا۔''

بڑی لڑکی: ''قلعے میں تو آپ بہت جایا کرتی ہیں۔ کیا وہاں بھی کبھی ایسے مزے کا پلاؤ نہیں کھایا؟''

سیّدانی: ''حسینی بادشاہ کے خاص رکاب دار کے ہاتھ کے بڑے بڑے تعریفی کھانے بیسیوں مرتبہ کھائے ہوں گے، مگر بیوی! وہ بُو باس، وہ آب و نمک ہی کچھ اور تھا۔ ہاں تو بہن، بس پھر کیا تھا، جو جو کھانے کھائے تھے بلکہ جن کا نام ہی سنا تھا، ان کا خیال کرتی گئی اور اللہ تیری شان، وہی مزہ آتا گیا۔ اچنبھے کی بات تھی کہ جب ایک پھل توڑتی، دوسرا اس کی جگہ فوراً نکل آتا۔ پھولوں، کلیوں کو جو چکھا، مٹھائیاں تھیں۔ ایسی ایسی نفیس، ہلکی خوش ذائقہ کہ ہر نوالے میں روح تازہ ہوتی چلی گئی۔ پیاس معلوم ہوئی، تو پانی کا خیال آتے ہی یاقوت کا گلاس خود بخود آکر منہ سے لگ گیا۔ یاقوت کا گلاس اور ایسا حباب کا کہ باہر سے پانی جھم جھم کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ڈر کے مارے مَیں نے زور سے ہونٹ بھی نہیں بھینچے کہ کہیں کنارہ ٹوٹ کر منہ میں نہ چُبھ جائے۔ اللہ اللہ! پانی کو نہ پوچھو، ایسا میٹھا، ایسا مُعطّر، ایسا سفید، پانی تو نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیا چیز تھی۔ سب کے بعد مَیں نے سوچا کہ پتّوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔

ساتھ ہی پان کا بھی خیال آیا۔ مَیں پان آج بھی بہت کم کھاتی ہوں، لیکن کھانا کھا کر دو وقت تو ضرور کھانے کی عادت ہے۔ اب جو پتّا توڑتی ہوں، تو پان کی خوش بُو، مُنھ میں جو رکھا، تو یہ معلوم ہوا کہ عطردان میں رکھی ہوئی گِلوری کلّے میں آگئی۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ رنگیلے کی کوکلا بائی جیسا پان کھاتی تھی، لال قلعے میں تو اس سے پہلے، نہ اس کے بعد کسی کو نصیب ہوا، مگر مَیں کہتی ہوں کہ اگر وہ پرستان کے اس پتّے کو ایک دفعہ صرف سونگھ لیتی، تو ساری عمر سر دُھنتی رہتی۔ مُشک و عنبر پڑے ہوئے کتھے اور سچّے موتیوں کے چُونے کا پان بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے۔ جب سانس لیتی تھی، نئی سے نئی خوش بو کی لپٹیں آتی تھیں۔

اب بہن! بادشاہ بیگم نے جن کا نام زُمُرَّد پری تھا، توشہ خانے والیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے کپڑے لاؤ۔ کشتیوں پر کشتیاں، تھان پہ تھان آنے لگے۔ کپڑوں اور گوٹا کناری کو دیکھ کر میری تو عقل جاتی رہی۔ بڑی بڑی رانیوں، شہزادیوں کے جوڑے دیکھے ہیں، نور بائی کی پشواز بھی دیکھی ہے جس میں سیروں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، لیکن اُن کپڑوں سے کیا نسبت۔ کُجا دُنیا کے کپڑے، کُجا پرستان کے۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ریشم اور سونے کے تاروں سے بنی ہوئی آبِ رواں، موتیوں سے لیسی ہوئی گلشن۔ ایسا ہی کم خواب اور زربفت کہ دید نہ شُنید۔ گوٹا وہ کہ دنیا دیکھے اور اَش اَش کرے۔ رنگ رنگ کے جواہرات کی لڑیاں تھیں۔ جب

سامان آ گیا، تو بادشاہ بیگم بولی: ''لو، بی سیّدانی، اب تم اپنا ہنر دکھاؤ۔ بہت تمھاری تعریف سنی ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ پرستان میں بھی تمھارا نام ہو جائے۔'' مَیں دل میں تو بہت پریشان ہوئی کہ یا اللہ مَیں یہاں کیا کاری گری دکھاؤں گی۔ کون سی وضع ٹانکوں کہ ان کے لیے نئی ہو، مگر زبان سے کہا: ''حضور! اللہ مالک ہے۔ وہی آبرو رکھنے والا ہے۔ صُبح ہونے دیجیے، جو کچھ مجھے آتا ہے، حاضر ہوں۔'' وہ ہنس کر بولی: ''سیّدانی بی، پرستان میں نہ دن ہوتا ہے نہ رات۔ ایک ہی موسم اور ایک ہی وقت رہتا ہے۔ تم جب چاہو کام شُروع کر دو۔'' مَیں نے تعجّب سے عرض کیا: ''تو کیا یہاں لوگ سوتے نہیں؟'' کہنے لگی: ''یہاں سونے کا کیا کام، نیند پرستان میں نہیں آتی۔ ہمارا مشغلہ تو آٹھوں پہر سیر سپاٹے ہیں۔ پرستان سے جی اُکتایا تو دُنیا والوں کے خوابوں میں چلے گئے۔''

بہن مَیں نے دیکھا کہ واقعی نیند کا نام بھی آنکھوں میں نہیں۔ نہ پیٹ میں گرانی نہ سر بھاری، نہ انگڑائیاں، نہ جمائیاں۔ سوچا کہ دیر کیوں لگائی جائے۔ کتر بیونت کا سامان تو موجود ہی تھا۔ اللہ کا نام لے کر جوڑے کترنے لگی اور اسی وقت سے سینے اور ٹانکنے کا لگا دیا۔ ادھر مَیں ایک طرف بیٹھی ہوئی اپنے کام میں مصروف تھی۔ اُدھر ناچنے گانے والی پریوں کے تخت اُتر رہے تھے۔ ایک سے ایک طرح دار، ایک سے ایک شوخ، اپنے فن میں اُستاد، نہ کانوں نے کبھی ایسا گانا سنا تھا، نہ آنکھوں نے ایسے ناچ دیکھے تھے۔ آوازیں تھیں کہ جیسے کوئلیں مل کر کوکیں، ناچ تھا کہ ہوا میں جیسے تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ کیا پوچھتی ہو بیگم! خدا کی قدرت کا تماشا تھا، لیکن مجھے تو اپنی فکر تھی کہ کہیں جلدی کام نبٹے اور چھٹکارا پا کر گھر جاؤں۔ ذرا کی ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتی اور اپنی سوئی چلانے لگتی۔

اُس کی کارسازی کے قربان، صدقے مشکل کُشا کے، عقل نے ایسا کام دیا اور پہلے ہی جوڑے میں واہ واہ ہو گئی۔ شہزادی کا چہرہ بھی خوشی کے مارے پھول کی طرح کِھل گیا۔ اب کیا تھا میرے ہاتھ پاؤں میں گھوڑے لگ گئے۔ دنوں کا کام گھڑیوں میں ہونے لگا۔ کہانی بہت لمبی ہے، کہاں تک کہوں جس کام کی آدمی دُھن باندھ لے، وہ ہو ہی جاتا ہے۔ آخر سارے جوڑے سِل بھی گئے اور ٹِک بھی گئے۔ کتنے دن لگے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ وہاں دنوں کا حساب ہی نہ تھا۔ ہاں اگر یہاں اتنا کام کرتی، تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، میرے اکیلے ہاتھ پر ایک سال سے کم نہ لگتا۔ اس عرصے میں ساری پریاں خاص طور پر شہزادی مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ ''خالہ سیّدانی''، ''خالہ سیّدانی'' کہتے کہتے اس کا منہ سوکھتا تھا۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی اور مجھ کو سوئی چلاتے دیکھا کرتی۔ تم جانو، پاس رہنے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اُس کی بھولی بھالی شکل پر پیار آتا تھا، مگر دل کو کیا کرتی یہ نگوڑا تو یہاں پڑا ہوا تھا۔ گھر کی یاد چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ہائے اپنا کھنڈلا پرستان میں بھی نہیں بھولا۔

آخر جب سارا کام اُن کی مرضی کے مطابق ہو گیا، تو مَیں نے کہا: ''حضور! خدا نے مجھے سُرخ رُو کیا۔ مولا نے میری آبرو رکھ لی۔ سرکار کی شہزادی کی شادی اور شہزادی کو یہ جوڑے پہننے مبارک ہوں۔ اب لونڈی کو رُخصت کیجیے۔'' بادشاہ بیگم بولی: ''سیّدانی بی، ہمارا جی چاہتا ہے کہ شہزادی کی شادی دیکھ کر جاؤ۔'' سچ کہوں میرا جی بھر بھر آیا مگر سوچا کہ سیّدانی دیوانی ہوئی ہے؟ تو خاکی یہ آتشی زیادہ میل اچھا نہیں۔ ذرا سی دیر میں بگڑ بیٹھیں تو جلا کر خاک کر دیں۔ بھاڑ میں جائے پرستان اور پرستان کی شادی۔ چل

اپنے گھر چل اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: ''شہزادی کی شادی آپ کو جم جم نصیب ہو، مجھے تو جانے دیجیے۔'' یہ سن کر شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی: ''سیّدانی بی، تم کیوں جاتی ہو؟ ہمارا دل کُڑھتا ہے، نہ جاؤ یہیں رہو۔'' میرے کلیجے پر چوٹ سی لگی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی: ''سیّدانی تم پر واری، بیوی تم اپنا جی بھاری نہ کرو، تم بلاؤ گی تو سو دفعہ آؤں گی۔ ایکا ایکی دنیا نہیں چھوٹ سکتی۔ مٹّی مٹّی میں خوش رہتی ہے۔'' شہزادی تو کچھ خفا اور کچھ روٹھتی سی ہو کر اُٹھ گئی۔ بادشاہ بیگم بولیں: ''اچھا بی سیّدانی، تمھاری مرضی۔ جاؤ خدا حافظ۔'' اور اسی کلموہے بکر گدھے کو حکم دیا کہ سیّدانی بی کو ان کے گھر پہنچا دے۔ ''خبردار! جو راستے میں کسی قسم کی شرارت کی اور دیکھو جو انعام و اکرام سیّدانی بی کو بادشاہ نے دیا ہے، وہ سب پالکی میں رکھ لینا۔''

دل میں خوش اور ظاہر میں بسورتی ہوئی سب سے رخصت ہوئی۔ وہی پری زاد جو مجھے پالکی سے اتار کر لائی تھی، ساتھ لے کر چلی۔ پھاٹک کے باہر پالکی موجود تھی اور مردوں کی سی وضع کا آدمی پاس کھڑا تھا۔ مَیں پالکی میں بیٹھی اور دَم کے دَم میں پالکی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پالکی میں بیٹھ کر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ وہ جو پرستان کے بادشاہ نے انعام و اکرام دیا ہے کہاں ہے، اندھیرے میں کیا نظر آتا۔ ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک کونے میں بہت سے کنکر پتّھر معلوم ہوئے۔ جل گئی کہ موئے جنّات تھے نا، یہاں بھی دغا کیا۔ یہ ان کے گھر کا انعام اکرام ہے۔ خیر، جان بچی، لاکھوں پائے۔ خیریت سے گھر پہنچ جاؤں تو جانوں بڑا انعام پایا اور چپکے چپکے ایک ایک کر کے وہ کنکر اور پتھر پردے کی جھری میں سے پھینکنے شروع کر دیے۔ قاعدہ ہے کہ خوشی میں راستہ جلدی کٹ جاتا ہے۔ آنکھ بند کرتے میں گھر آ گیا۔ ڈیوڑھی میں پالکی رکھی گئی۔ چراغ جل رہا تھا۔ پردہ جو اُلٹا اور چراغ کی جوت جو پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جنھیں مَیں کنکر پتھر سمجھ رہی تھی، جواہرات ہیں۔ بڑے بڑے تو مَیں نے سب پھینک دیے تھے۔ دو چار ننھے ننھے سے باقی تھے۔ سر پیٹ لیا کہ اتنی دولت کھوئی۔ نگوڑی، پھینکنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا ہی تھا، تو گھر آ کر پھینک دیتی، لیکن بہن! تقدیر کی کھوٹ کہاں جاتی ہے؟ نصیب میں تو پتھر بھی نہ تھے، ہیرے، لعل، زُمرّد کیوں ملتے؟ ایک ایک پیر من من بھر کا ہو گیا۔ صرف چار نگینے رہ گئے تھے۔ وہی لے کر بڑی مشکل سے اُتری۔ گھر میں جو پہنچی تو بونٹ پلاؤ جیسا چھوڑ گئی تھی ویسا ہی دم پر لگا ہوا تھا۔ بڑی بی، پکانے والی، مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ چکیں، تو اُنھوں نے پوچھا: ''بیگم کیا راستے میں سے اُلٹے پاؤں آ گئیں، خیر تو ہے؟'' مَیں نے دل میں کہا: لیجیے، یک نہ شُد دو شُد، پرستان میں خدا معلوم کتنے مہینے لگ گئے اور یہاں ابھی چاولوں کو دَم بھی نہیں آیا اور بڑی بی سے بولی: ''ہاں بی، بھوک لگی ہوئی تھی اور کچھ جی بھی ٹھیک نہ تھا۔ راستے ہی سے آ گئی۔ اب اِن شاء اللّٰہ کل جاؤں گی۔''

(دہلی کی چند عجیب ہستیاں)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) سیّدانی بی نے گزر اوقات کے لیے کون سا پیشہ اختیار کیا؟

(ب) میر صاحب اور ان کی بیوی سیّدانی بی کی کس بات پر زیادہ خوش تھے؟

(ج) پرستان کے بادشاہ نے سیّدانی بی کو کس کام کے لیے بلوایا تھا؟

(د) بادشاہ بیگم کا اصلی نام کیا تھا؟

(ہ) پرستان کے پھلوں کی خاص بات کیا تھی؟

۲۔ سیّدانی بی نے پرستان کا تذکرہ دل چسپ انداز میں کیا ہے۔ آپ اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ لکھیے۔

۳۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق ''پرستان کی شہزادی'' کس مصنف کی تحریر ہے؟

(i) شاہد احمد دہلوی (ii) ہاجرہ مسرور

(iii) اشرف صبوحی (iv) سجاد حیدر یلدرم

(ب) قلعے کی بڑی بڑی مغلانیاں، سیّدانی بی کے سامنے:

(i) کام کرتی تھیں (ii) کھڑی رہتی تھیں

(iii) دم نہ مارتی تھیں (iv) کان پکڑتی تھیں

(ج) پرستان کے بادشاہ نے سیّدانی بی کو بلایا تھا:

(i) بیٹی کا جہیز ٹانکنے کو (ii) انعام دینے کو

(iii) بیٹی کو سینا پرونا سکھانے کو (iv) بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے

(د) سیّدانی بی کو کھانے میں مرغوب تھا:

(i) زردہ (ii) بونٹ پلاؤ

(iii) فیرنی (iv) بریانی

(ہ) پرستان میں پھل دار پودے بڑے تھے:

(i) بالشت بھر (ii) چھے فٹ

(iii) ایک ایک فٹ (iv) گز بھر

(و) پرستان سے سیدانی بی کو انعام میں کیا ملا؟

(i) روپیا پیسا (ii) کنکر پتھر

(iii) خلعت اور زیورات (iv) جواہرات

۴۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے:

آنکھیں کھُلنا، بال بیکا ہونا، کلیجے پر سانپ لوٹنا، اوسان خطا ہونا، عقل جاتی رہنا

۵۔ کالم (الف) کا ربط کالم (ب) سے کریں:

کالم (الف)	کالم (ب)
مرہٹہ گردی	خوش مزاج
میر صاحب	جن
انڈا شہزادی	تباہی
بکر گدھا	دھاک
ہنر	کانڑا دیو

۶۔ سبق کے مطابق درست لفظ کے ذریعے سے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) ایک وقت تھا کہ.................میں سیّدانی بی کا بڑا مقام تھا۔ (قلعہ، محل، دربار)

(ب) سیّدانی بی کو مغلانی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا کیوں کہ............۔

(اس کے والدین فوت ہو گئے، تجارت میں خسارہ ہو گیا، وہ بیوہ ہو گئیں)

(ج) اس نے کہاروں سے کہا: ''کم بختو! منہ سے کچھ تو.................۔ (کہو، پھوٹو، بولو)

(د) پرستان میں اسے......................لے کر گیا۔ (جن، پری زاد، فرشتہ)

(ہ) بادشاہ نے اسے.......................انعام میں دیے۔ (زیورات، جواہرات، ملبوسات)

ذُو معنی الفاظ:

ایسے الفاظ کا املا تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن ان کے دو معنی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض اوقات لفظ ایک معنی میں مذکر جب کہ دوسرے معنوں میں مؤنث ہوتا ہے۔

۷۔ ذیل کے جملوں میں سے ذُو معنی الفاظ الگ کر کے ان کے معانی لکھیے:

(الف) بارشوں سے آئینے کی آب جاتی رہی۔

(ب) سوات میں کون سی کان ہے؟

(ج) بادشاہ بیگم کے حکم پر شہزادی کے کپڑوں کے لیے تھان پہ تھان آنے لگے۔

(د) حق بات کہنے کی پاداش میں وہ دار پر جھول گیا۔

(ہ) جہاں چاہ وہاں راہ۔

۸۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد تحریر کیجیے:

لطیف، شب، خشک، جُفت، شیریں، نشیب، تِریاق

تشبیہ

علمِ بیان کی اصطلاح میں کسی چیز کو خاص وصف کی وجہ سے کسی دوسری چیز کی مانند قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے، جیسے:

۱۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔

۲۔ صہیب شیر کی مانند دلیر ہے۔

اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

جب ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے تو دونوں میں کسی مشترک وصف کا پایا جانا ضروری ہے، دوسرا یہ کہ جس چیز سے تشبیہ دی جائے اس میں یہ خوبی یا وصف زیادہ ہو۔

تشبیہ کے پانچ ارکان ہیں:

۱۔ مشبہ: جس چیز کو دوسری چیز جیسا کہا جائے۔

۲۔ مشبہ بہ: جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔

۳۔ وجہِ شبہ: وہ مشترک صفت جس کی وجہ سے ایک چیز کو دوسری چیز جیسا کہا جاتا ہے۔

۴۔ غرضِ تشبیہ: جس مقصد کے لیے تشبیہ دی جاتی ہے۔

۵۔ حرفِ تشبیہ: وہ الفاظ یا حروف جو تشبیہ دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً طرح، مانند، جیسا، جیسی، سا وغیرہ۔

اوپر دی گئی دو مثالوں کے ارکان اس طرح ہیں:

مشبہ	مشبہ بہ	وجہِ شبہ	غرضِ تشبیہ	حرفِ تشبیہ
پانی	برف	ٹھنڈک	ٹھنڈا پن ظاہر کرنا	طرح
صہیب	شیر	بہادری	بہادری کا اظہار	مانند

سرگرمیاں

۱۔ سیّدانی بی کا مختصر خاکہ لکھیں۔

۲۔ دس جملوں میں پرستان کی تصویر کشی کریں۔

۳۔ سیّدانی بی نے پرستان کے پھلوں کا ذکر کیا ہے، ان کی چند خوبیاں کاپی میں لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو داستان، ناول اور مختصر افسانے سے متعارف کرایا جائے۔

۲۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مضمون ''پرستان کی شہزادی'' داستان ہے یا ناول، مختصر افسانہ ہے یا صِنفِ نثر کی کوئی اور قسم ہے اور کیوں؟

۳۔ اشرف صبوحی کے سوانحی حالات، طرزِ تحریر اور ان کی کہانیوں اور خاکوں پر مشتمل کتب سے متعارف کرایا جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی
(۱۹۲۵ء-۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر وحید قریشی میانوالی میں پیدا ہوئے۔ اصل نام عبدالوحید تھا۔ والد محمد لطیف قریشی محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے ڈاکٹر صاحب کی سکول کی تعلیم مختلف شہروں میں ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز اور ۱۹۴۶ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے فارسی کیا۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ، پی ایچ ڈی فارسی اور ڈی لٹ اُردو کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں تاریخ کے لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ اور فارسی اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اُردو کے استاد رہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں مختلف مناصب (صدرِ شعبۂ اُردو، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، ڈین کلیہ علوم شرقیہ و اسلامیہ) پر بھی فائز رہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک مُقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین رہے۔ مختلف اوقات میں بطور اعزازی معتمد بزمِ اقبال لاہور، ناظم اقبال اکادمی پاکستان اور مہتمم مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اردو اور فارسی زبان و ادب کے ایک اہم محقق اور نقاد تھے۔ ان کا زیادہ تر سرمایۂ ادب تنقیدی کتب پر مشتمل ہے۔ اگرچہ وہ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کی بنیادی حیثیت محقق اور نقاد کی ہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر حکومتِ پاکستان نے انھیں تمغا برائے حسنِ کارکردگی اور صدارتی اقبال ایوارڈ عطا کیا۔

ان کی تصانیف میں اساسیاتِ اقبال، نذرِ غالب، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، اقبال اور پاکستانی قومیت، مطالعۂ ادبیاتِ فارسی، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، مقالاتِ تحقیق، تنقیدی مطالعے، اُردو نثر کے میلانات، مطالعۂ حالی اور میر حسن اور ان کا زمانہ شامل ہیں۔

اُردو ادب میں عید الفطر

تدریسی مقاصد

۱۔ اردو ادب میں اسلامی تہواروں کا تعارف کرانا۔
۲۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے اسلوب سے آگاہ کرنا۔
۳۔ اسلامی تہذیب وتمدن، معاشرت اور رسوم ورواج سے واقفیت دلانا۔
۴۔ طلبہ کو ادب پارے کی روشنی میں، مشاہدات کو بہتر انداز میں تحریر کرنا سکھانا۔
۵۔ طلبہ کو مضمون اور افسانے کی صِنف سے آگاہ کرنا۔

اُردو کی غزلیہ شاعری میں عید، عید کا چاند، ہلال وابرو، محبوب سے روزِ عید کی ملاقاتیں اور اس کے متعلقات ہی اہم رہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب اُردو شاعری کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی اور نظموں کی طرف توجہ تیز ہوگئی تو عید کے موضوع میں بھی اشاراتی اور علامتی امکانات زیادہ اُجاگر ہوئے اور اُردو شاعری کو ۱۸۵۷ء کے بعد مِلّی احساسات کی ترجمانی کا وسیلہ بھی بنایا گیا اور اس طرح مسلمانوں کی فکری زندگی کے خط وخال نے اُردو ادب میں اسلامی اقدار وروایات کی پاسداری کے عمل کو شدید سے شدید تر کر دیا۔ عید الفطر پر نظموں کی کثرت کا سبب بھی یہی ہے اور شعرا وادبا نے جب تخلیقی جوہر کے حوالے سے ان افکار کی پیش کش کا سامان فراہم کیا تو یہ موضوع کئی جہتوں میں پھیل گیا۔ عید کو محض خوشی یا عید کے چاند کو محض سال میں ایک بار جھلک دکھا کر غائب ہونے کے حوالے سے دیکھنے کی بجائے اسے مسلمانوں کی تہذیبی اور فکری زندگی کے وسیع تر جغرافیے سے ملا دیا گیا، جسے عید کے موضوعات میں نئی نئی باریکیاں پیدا کر کے اسے ادبی خوشی کے ملے جلے جذبات تک لے گئے۔ گلدستۂ عید میں موضوعات، صحنِ عید گاہ میں ملاقات اور درونِ خانہ عید ملن تک محدود نہیں رہے بلکہ جذبات کے وسیع تر رقبوں میں لا کر دکھایا گیا ہے۔ ''مسلمان فیشن ایبل خاتون کی ڈائری'' سے چل کر ''رسول پاک صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عید''، ''کنواری بیٹی کی عید''، ''سہاگن کی عید''، ''بچوں اور بڑوں کی عید''، ''دوگانی عید''، ''ترکن ماما کی عید''، ''عید اور قرض''، ''عیدی''، ''گھر کی مالکہ کی عید''، ''رمضان اور خیرات''، ''یتیموں کی عید'' تک عید الفطر ہمیں متوسط طبقے اور غریب طبقے کے مسائل وحالات سے منسلک نظر آتی ہے۔ اس تمدنی پس منظر کے طفیل ایک وقتی جذبۂ ہیجان نہیں بلکہ ایک تہذیبی اکائی بن کر ہماری معاشرتی زندگی میں بہت دور تک جاتی ہے۔ اس وُسعت پذیری سے موضوع کی جڑیں ہماری ادبی روایات میں پھیل گئی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے دِلّی کی بربادی کے جو نوحے لکھے ہیں، ان میں دولت وعزت سے محروم ہونے والے شہزادوں اور شہزادیوں کی کس مپرسی میں عید بسر کرنے کا ذکر اہمیت رکھتا ہے۔ اس

روایت کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوتا ہے، جنھوں نے ''مسلمانانِ ہند کی عید'' کے عنوان سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی خامیوں کو بیان کرنے کے علاوہ، ان کی غریبی کے نقشے بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ حسن نظامی کے موضوعات میں ''عظمتِ رفتہ کی یاد'' عید کو علامتی حوالہ عطا کرتی ہے۔ ''یتیم شہزادے کی عید''، ''عید گاہِ ماغریباں کوئے تو'' دینی جذبے کی شدت اور مذہبی اُمور سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ان نثر پاروں کے اثرات ہماری شعری روایات پر بھی پڑے ہیں۔ حالؔی کی نظم ''تہنیتِ عید الفطر'' میں خوشی کے جذبے کی عکاسی کے علاوہ عید کو مذہبی اقدار سے بھی ہم آہنگ کیا گیا ہے:

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا
خوشی کی عید کا حق ہر کوئی بجا لایا
کیا ہے شُکرِ خداوند روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے بھر پایا

اقبالؔ کے ہاں ہلالِ عید صرف ہمیں خوش ہی نہیں کرتا، ہماری ہنسی بھی اڑاتا ہے۔ یتیموں کی عید کے بارے میں بھی اقبالؒ اس رویّے کی عکاسی کرتے ہیں جس پر نثر نگار بھی خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ یادِ طفلی علامہ اقبالؒ کو عید کے چاند کی تصویر کشی پر مجبور کرتی ہے اور وہ منظر کشی والے رجحان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں:

اے مہِ عید! بے حجاب ہے تُو
حُسنِ خورشید کا جواب ہے تُو
تُو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذّت افزائے شورِ طفلی ہے

مجموعی طور پر عید الفطر سے متعلق موضوعات ہماری شاعری کے بنیادی رُخ کو ظاہر کرتے ہیں:

اوّل: عید کے چاند کو مناظر کے حوالے سے بیان کرنے کا رجحان۔
دوم: عید کو داخلی مسرت اور خارجی حالات سے منسلک کرنے کا رویہ۔
سوم: ہلالِ عید کو مِلّی عزائم کی علامت، ملّت کے عروج و زوال کی علامت اور تہذیبی و تمدنی زندگی کی اساس کے طور پر قبول کرنے کا رجحان۔

حفیظ جالندھری:

چاند جب عید کا نظر آیا
حال کیا پوچھتے ہو خوشیوں کا

آسماں پر ہوائیاں چھوٹیں
نوبتیں مسجدوں میں بجنے لگیں
شُکر سب خاص و عام کرنے لگے
اور باہم سلام کرنے لگے

عبدالمجید سالکؔ:

ہلالِ عید کی گردُوں پہ آمد آمد ہے
جو راحتِ نظرِ اُمتِ محمدؐ ہے
ہزار شُکر کہ مُسلم ہیں شاد آج کے دن
سبھی جہان میں ہیں با مراد آج کے دن

طالبؔ الہٰ آبادی:

جو کچھ بھی ہو تو آج اثر اپنا دکھا دے
روٹھے ہوئے مُسلم جو ہیں اُن سب کو منا دے
آپس میں جو دن رات کا جھگڑا ہے وہ مِٹ جائے
اسلام میں جو تفرقہ پیدا ہے وہ مِٹ جائے

اس رجحان نے تخلیقی سطح پر ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے موقع نہ ہوگا کہ عید کا تصور مسلمانوں کے ہاں محض تہوار منانے اور اُچھل کود کو کلچر بنانے پر منحصر نہیں بلکہ اس خوشی کا رشتہ ہماری اقدار میں بہت دُور تک جاتا ہے، جس سے عید کے بارے میں اُردو شعرا کی تخلیقات کو ایک سمت ہی نہیں ملتی بلکہ ان کا تعلق ہمارے داخلی رویوں کے ساتھ اتنا گہرا ہے کہ ہماری شعری روایت میں یہ عمل صرف یک طرفہ مناظر کشی تک جا کر ختم نہیں ہوتا۔ عید کی شاعری ہماری شعری روایات کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش حصّہ ہے۔

(اُردو نثر کے میلانات)

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) عیدالفطر کا ہماری تہذیبی اور دینی زندگی سے کیا تعلق ہے؟

(ب) عیدالفطر پر نظموں میں، شعرا نے کیا باریکیاں پیدا کی ہیں؟

(ج) اس سبق کی روشنی میں اردو شعرا نے عیدالفطر کے جن متعدد پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے، اُن میں سے کوئی سے تین پہلوؤں/موضوعات کے نام لکھیے۔

(د) عیدالفطر کے موقع پر شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر کرتے ہوئے، خواجہ حسن نظامی نے کیا نکتہ اُجاگر کیا ہے؟

۲۔ اردو شعرا نے ہر دور میں عیدالفطر کو موضوعِ سخن کیوں بنایا؟

۳۔ کون سی چیز اقبالؒ کو عید کے چاند کی تصویر کشی پر مجبور کرتی ہے؟

۴۔ ''مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا'' یہ اردو کے کس معروف شاعر کا مصرع ہے؟

۵۔ عید کی شاعری کا ہماری شعری روایات سے کیا تعلق ہے؟

۶۔ سبق کے متن کو مدِّنظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اردو شاعری میں وسعت پیدا ہوئی۔ درست/غلط

(ب) خواجہ حسن نظامی نے دِلّی کی بربادی کے مرثیے لکھے ہیں۔ درست/غلط

(ج) عیدالفطر کے متعلق موضوعات ہماری شاعری کا اصل رخ ظاہر کرتے ہیں۔ درست/غلط

(د) سبق میں چار شعرا کے اشعار درج ہیں۔ درست/غلط

(ہ) عیدالفطر کا تصور ہماری اقدار میں شامل ہے۔ درست/غلط

۷۔ درست جواب کی نشان دہی (✓) سے کیجیے:

(الف) یہ مصرع کس شاعر کا ہے؟ ''ہلالِ عید کی گردُوں پہ آمد آمد ہے''

(i) اقبالؒ (ii) حفیظ جالندھری (iii) عبدالمجید سالک (iv) حالی

(ب) حسن نظامی نے دِلّی کے جو نوحے لکھے، ان میں کون سی چیز نمایاں ہے؟

(i) عظمتِ رفتہ (ii) احساسِ شادمانی (iii) عبرت انگیزی (iv) لُطف و مسرت

(ج) عیدالفطر کے موقع پر مُسلم معاشرے کے کس طبقے کو سب سے زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

(i) اُمرا (ii) غُربا (iii) متوسط (iv) سفید پوش

(د) شاعر نے ''لذّت افزائے شورِ طفلی'' میں کس کی طرف اشارہ کیا ہے؟

(i) بادل (ii) ستارے (iii) عیدالفطر کا چاند (iv) نمازِ عیدالفطر

(ہ) ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد توجہ تیز ہوگئی:

(i) غزلوں کی طرف (ii) نظموں کی طرف (iii) مرثیے کی طرف (iv) شہرِ آشوب کی طرف

۸۔ مصنف نے عید کا تعلق تہوار کے علاوہ کس سے جوڑا ہے؟ دو تین سطروں میں جواب لکھیں۔

مضمون

کسی مقررہ موضوع پر اپنے خیالات، جذبات، احساسات یا تاثرات کا نثر میں تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں، اس لیے ہر قسم کے موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جاتے ہیں۔ مضمون نویسی میں پہلے موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے، پھر دلائل دے کر بحث کی جاتی ہے اور اہم باتیں علمی پیرائے میں تحریر کی جاتی ہیں اور آخر میں مختصراً نتیجہ پیش کیا جاتا ہے۔ توازن، تناسب اور نظم وضبط اس کے اہم تقاضے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اخبارات اور انٹرنیٹ کی مدد سے عیدالفطر سے متعلق مختلف تصاویر جمع کر کے، انھیں ایک چارٹ پر لگائیں۔

۲۔ عیدالفطر کے دن کی مصروفیات کی تفصیلی رُوداد لکھ کر، استاد صاحب کو دکھائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ پر واضح کریں کہ اسلامی تہذیب میں عیدالفطر کی اہمیت کیا ہے۔

۲۔ طلبہ کو سمجھائیں کہ عیدالفطر کے موقع پر فضول خرچی، بے جا نمود و نمائش اور دیگر غیر اسلامی طور طریقے، دینی تقاضوں کے خلاف ہیں۔

۳۔ طلبہ کو ڈاکٹر وحید قریشی کے علمی و ادبی مقام و مرتبے سے آگاہ کیا جائے۔

☆☆☆

سجاد حیدر یلدرم
(۱۸۸۰ء-۱۹۴۳ء)

سجاد حیدر یلدرم کے جدِّ امجد وسطِ ایشیا سے ہندوستان آئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں ان سے جاگیریں چھن گئیں تو وہ ملازمت کی طرف آ گئے۔ یلدرم یو پی کے ایک قصبے نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، ان کا بچپن بنارس میں گزرا اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی اے کیا۔ اس کے ساتھ ہی ذاتی شوق سے ترکی زبان سیکھی اور بغداد کے برطانوی قونصل خانے میں ترجمان کے طور پر کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ قُسطُنطُنیہ میں بھی رہے اور ترکی زبان و ادب کا مزید مطالعہ کیا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے رجسٹرار کے طور پر کام کیا۔ پھر جزائر انڈمان میں ریونیو کمشنر رہے۔ ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

سجاد حیدر یلدرم صاحبِ طرز ادیب، مترجم اور شاعر تھے۔ افسانہ نویسی اور ترکی زبان سے اردو میں تراجم ان کی شہرت کا سبب بنے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر خیالات و موضوعات ترکی ادب سے ماخوذ ہیں۔ خیالستان ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں رومانیت کا رنگ غالب ہے اور یہ انشائے لطیف کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کی انشا پردازی میں حسِ مزاح بھی شامل ہے۔

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

تدریسی مقاصد

۱۔ معاشرے میں مختلف افراد کے غلط رویّوں کی نشان دہی کرنا۔
۲۔ دوستی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا۔
۳۔ ''وقت دولت ہے'' اس کی قدر و قیمت سے واقفیت دلانا۔
۴۔ یلدرم کے زبان و بیان سے متعارف کرانا۔
۵۔ طلبہ کو جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ کو ترکیبِ نحوی میں ڈھالنے کی تربیت دینا۔

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن مَیں دِلّی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی، جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالتِ زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انھی الفاظ اور اسی پیرائے میں دُہرادی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ مَیں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا، جسم موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوب صورت ہوتا، مگر بد معاشی اور بے حیائی نے صورت مَسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو مَیں ایسا قسیُ القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے۔ چناں چہ وہ اسپیچ یا صدا، جو کچھ کہیے، یہ تھی:

''اے بھائی مسلمانو! خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ مَیں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کو محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ مَیں بھیک نہیں مانگتا۔ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں، مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! مَیں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، ہائے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خدا کے بندو! میری سنو، مَیں غریب الوطن ہوں............''

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اس قصے کا اثر ہوا، ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا، لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور مَیں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر اُمور میں، مَیں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ مَیں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ مَیں نے تعلیم پائی ہے، وہ جاہل ہے۔ مَیں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ

پھٹے پُرانے کپڑے پہنتا ہے۔ بس، یہاں تک مَیں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اُس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھّی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے۔ مَیں رات دن فکر میں گزارتا ہوں، اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے، اُس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے اور آخر کار مَیں اس بظاہر عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے، وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ ''میرا کوئی دوست نہیں۔'' مَیں حسرت سے کہتا ہوں ''میرے اتنے دوست ہیں۔'' اس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے، تو اُسے مبارک باد دینی چاہیے۔

مَیں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے، کہتا ہے: میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تُو مجھ سے بڑھ گیا۔ لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟

یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں، جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فُرصت نہ دے۔ مَیں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں، مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ مَیں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انھیں اطمینان سے قلم بند کر سکوں، یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے، اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دِن دہاڑے اپنا روپیا لے جا سکتا ہے، اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا:

''بھائی جان! دیکھو، پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اس وقت ضرورت ہے، تھوڑا سا روپیا قرض دو۔'' کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں مگر یار دوستوں کا مجمع ہے، جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں، جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور رِیویو لکھنا پڑے؟ کیا اُسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہُوحق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا؟ اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اگر اِن سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ ہٹّا کٹّا ہے اور مَیں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللّٰہ، کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا، خدا جانے وہ کون سی نعمت چاہتا ہے؟ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بے ہودہ خیالات ہیں۔ بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ ان سے بھاگتا ہے مگر مَیں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ مَیں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے، مجھے فائدہ پہنچانے کا، اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے، مگر مَیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ احباب کا ایک جمِّ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ مَیں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں

کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا، چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں، جنھیں مَیں بھَڑ بھَڑ یا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری اُن کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے مگر حضرت کی خِلقت میں داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے، شور مچاتے ہوئے، چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ اُن کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو مَیں کہتا ہوں:

''کوئی آ رہا ہے قیامت نہیں۔'' اُن کے آنے کی مجھے دُور سے خبر ہو جاتی ہے، باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرا چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ ''میاں! اس وقت کام میں بہت مشغول ہیں'' تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) ''خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے! توبہ توبہ! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ مَیں پہلے ہی سمجھتا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اوپر آتے ہیں اور دروازہ اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولا آ کے لگا۔ (آج تک انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:

''آہاہاہا! آخر تمھیں مَیں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو، دیکھو، میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ مَیں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ مَیں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللّٰہ! مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے، جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں، مَیں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمھاری خیریت دریافت کرنی تھی، خدا حافظ۔''

یہ کہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور مَیں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علاحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کُل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اب وہ کہاں؟ اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے، تاہم وہ اگر گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا مَیں انھیں چھوڑ سکتا ہوں؟ مَیں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں، تاہم مَیں انھیں چھوڑ دوں گا۔ ہاں چھوڑ دوں گا، اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجیے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انھی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں جب مَیں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں، لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل

یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں، ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اَور کوئی مضمون ہی نہیں۔ مَیں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر مَیں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں: ''ہاں! بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے بچے کو بخار آ گیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالیٹکس ① یا لٹریچر ② کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ ''طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟'' کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمے باز دوست ہیں، جنھیں اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریقِ مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمّت کے (تعریف اس حالت میں جب کہ انھوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں، مِن جُملہ اَور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے، مَیں محمد شاکر خاں صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا، کیوں کہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر خاں صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت مُعزّز آدمی ہیں۔ انھیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری ③ آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ علم کی تھوڑی سی قدر کرنا، امرا کے شایانِ شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے، یہ کہ کے:

''شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیلیِ آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ مَیں نے ایک کمرا خاص تمھارے واسطے آراستہ کرایا ہے، جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو، میری خوشی کرو۔''

مَیں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا؟ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر مَیں ان کے ساتھ ہولیا۔ ایڈیٹر معارف سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصے میں اُن کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر مَیں نے وہ کمرا دیکھا، جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی اور ایک نہایت ہی دل فریب نیچرل ④ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو مَیں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالا چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے کو جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اِصرار ہونے لگا کہ: ''ہیں! ہیں؟ کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔

۱۔ Politics

۲۔ Literature

۳۔ Literary

۴۔ Natural

چلیے، گاڑی تیار کراتے ہیں، دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے، پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجا طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔''

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! خیر سیکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو مَیں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا، یعنی یک سُوئی کی تلاش میں مَیں سرگرداں تھا، وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

مَیں جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا، جو میرے لکھنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کام دار کپڑا پڑا ہوا تھا، جس پر ایک قطرہ گرانا گناہِ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات، مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نِب ندارد، جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتا نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں ضرورت کی تھیں، وہ موجود نہیں۔ آخر کار مَیں نے وہی اپنا پرانا استعمالی، مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمان داری سے میری مدد کی تھی اور میرے پرّاں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفسِ کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا، اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رَطبُ اللِّسان ہیں، ان کی عنایت سے مَیں خوش نہیں ہوا کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا، تاہم مَیں نے کوشش کر کے اُن کی طرف سے کان بند کر لیے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن تن، تننتانا، چھن، تاتن، تن، تن، تن، مَیں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکا یک اس تن تن نے چونکا دیا۔ یہ کیا ہے؟ اُفوہ! اب مَیں سمجھا، میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے! انھیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے تھے۔ بہت خوب بجا رہے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ انھوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہو گئی تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

''اے میرے خیالات! تمھی میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو، خدا کے لیے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آ جاؤ'' یہ کَہ کے مَیں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں، کہاں چھوڑا ہے۔

''جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے، اتنے دنوں کہاں رہے؟''

یہ کیا مُہمل فقرہ ہوا! لاحول ولا قوۃ۔ مَیں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔

''آپ کہاں بھول پڑے، اتنے دنوں کہاں رہے۔'' یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں، جو ابھی اُن سے ملنے آیا ہے۔مَیں مصروفیت میں انھیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیے''اور جن کی قدر ابھی تک ملک وقوم کو معلوم نہیں ہوئی ہے اور باہر.................

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

''کون ہے؟''

''مَیں ہوں شبّن! سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لیے تشریف لائیے۔کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انھیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔''

بادلِ ناخواستہ مَیں اٹھا اور نیچے گیا۔شاکر صاحب کے دوست راجا طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور مَیں نے یک سُو ہو کر لکھنا شروع کیا۔تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبّن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اَور دوست آئے ہوئے ہیں اور مَیں انھیں دِکھایا جاؤں گا۔گویا مَیں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا، جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دِکھایا جاتا تھا۔ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر مَیں پھر اپنے کمرے میں آیا، خیالات غائب ہو گئے تھے۔فقرہ ازسرِ نو پھر بنانا پڑا۔طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہ ہزار دِقّت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا، جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور مَیں لکھ رہا تھا:

''ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان، جنھیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس ① کی طرح نئی معلومات اور نئی دنیا(گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں.................''

دروازے پر پھر دستک۔

''کیا ہے؟''

''اچھا''

''دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے ،ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ.................''

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

۱۔ کولمبس،ایک یورپی جہاز ران جس نے ہندوستان کی طرف سفر کرتے ہوئے برِّ اعظم شمالی امریکہ دریافت کیا۔

''ہاں''

''حضور! سرکار آپ کا انتظار کررہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔''

''افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا: میرا انتظار نہ کریں، مَیں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔''

''............اور آیندہ نسلوں کو زیر بارِ احسان کریں گے۔ یہی نوجوان ہیں، جو قوم کی کشتی کو، خدا کی مدد پر بھروسا کر کے، خطرات سے بچاتے اور ساحلِ مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ............''

دستک

''کیا ہے؟''

''سرکار کہتے ہیں، اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے، مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا۔''

''اچھا بھائی، لو ابھی آیا۔''

یہ کہ کے مَیں کھانے کے لیے جاتا ہوں، سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں: ''چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا، دیکھو! میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟''

سوائے اس کے کہ مَیں آمنّا وصدّقنا کہوں اور کیا کہ سکتا تھا؟ اب کھانے پر اِصرار ہوتا ہے، جس چیز سے مجھے رغبت نہیں، وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں: ''سہ پہر کو تمھیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ مَیں تمھیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو۔''

واپس کمرے میں آ کر مَیں تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں اور پھر لکھنا شروع کر دوں مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں: ''زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ!'' اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے کیوں کر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ بہت صحیح پاتا ہوں۔ ''زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ'' بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک!

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے، سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مَیں فوراً نیچے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ، جو میزبان صاحب کہتے ہیں، وہ ہوتا ہے: ''آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے۔'' مَیں سچی بات کہوں کہ ''کچھ بھی نہیں لکھا'' تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ ''آخر اس قدر کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے:

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
مجھے یقیں ہوا اور مجھ کو اعتبار آیا''

مل ملا کر شام کو واپس آئے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی ہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں، وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصے اور رنج میں آ کر اسے پھاڑ دیتا ہوں اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ مَیں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا مگر مَیں مجبور ہوں، اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

مَیں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں اُن اَحباب کی فہرست ختم ہوگئی، جن سے مَیں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں، ابھی بہت سے باقی ہیں، مثلاً ایک صاحب ہیں، جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے مگر جب آتے ہیں، مَیں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں، جو ہمیشہ ایسے وقت میں آتے ہیں جب مَیں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں، جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں: ''میاں! عرصے سے میرا دل چاہتا ہے، تمھاری دعوت کروں۔'' مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں، وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ جب مَیں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں، جو جب آتے ہیں، اپنی ہی کہے جاتے ہیں، میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں۔ مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں، صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں:

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

☆☆☆☆

(خیالستان)

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) چاندنی چوک میں فقیر کی تقریر کا لُبِّ لُباب کیا تھا؟

(ب) مصنّف پر اس فقیر نے کیا اثر کیا؟

(ج) مصنّف کو اپنے بے تکلف دوست بھڑ بھڑیا سے کیا شکایت ہے؟

(د) محمد تحسین کی گفتگو کا محور کیا ہوتا ہے؟

(ہ) مصنّف کے کون سے دوست ادب کے زیادہ دل دادہ ہیں؟

۲۔ سبق کے متن کو نظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) آفت کا مارا فقیر کتنے بچوں کا باپ تھا:

(i) تین (ii) پانچ

(iii) سات (iv) نو

(ب) مصنف نے کس مصیبت کو فقیر کے لیے نعمت تصوّر کیا ہے؟

(i) روٹی کی محتاجی (ii) دوست نہ ہونا

(iii) غریب الوطنی (iv) بھیک مانگنا

(ج) مصنف نے کس دوست کو بھڑ بھڑیا دوست کہا ہے؟

(i) محمد تحسین (ii) احمد مرزا

(iii) قرض خواہ دوست (iv) مقدمے باز دوست

(د) شاکر صاحب مصنف کو لے گئے:

(i) سلیم پور (ii) دِلّی

(iii) جے پور (iv) شاہ پور

(ہ) مصنف کا دوست زیادہ بے تکلف اور شور مچانے والا ہے:

(i) احمد مرزا (ii) شاکر صاحب

(iii) قرض خواہ دوست (iv) محمد تحسین

(و) مصنف کے دوست اُنھیں راجا صاحب سے ملوانے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

(i) جام نگر (ii) احمد نگر

(iii) الٰہ آباد (iv) احمد آباد

(ز) مصنف جس کمرے میں ٹھہرائے گئے اس کی کھڑکی کھلتی تھی:

(i) باغ میں (ii) چٹیل میدان کی طرف

(iii) پائیں باغ میں (iv) دریا کی سمت

۳۔ متن کی روشنی میں درست لفظ چن کر خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) چاندنی چوک میں صدا لگانے والا فقیر.............................. تھا۔ (بھوکا، بیمار، غریب الوطن)

(ب) احمد مرزا کی خِلقت میں داخل ہے کہ دو منٹ.......... نہیں بیٹھا جاتا۔ (خاموش، نچلا، پُرسکون)

(ج) مصنّف کو لکھنے پڑھنے سے منع کرنے والے دوست کا نام............ ہے۔ (احمد مرزا، محمد تحسین، شاکر خاں)

(د) احمد نگر کے رئیس کا نام.................. ہے۔ (شاکر خاں، احمد علی، طالب علی)

(ہ) میرے............ دوست کا نام شاکر خاں ہے۔ (ادب پسند، مقدمے باز، شکاری)

۴۔ سبق کے متن کو مدِّ نظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) چاندنی چوک میں ایک بدصورت فقیر صدا لگا رہا تھا۔ درست/ غلط

(ب) فقیر کے پاس سب کچھ تھا، اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ درست/ غلط

(ج) احمد مرزا کو مصنف نے ''بھڑ بھڑیا'' کا نام دیا ہے۔ درست/ غلط

(د) شاکر خاں کے ہاں سیاہی کی دوات خشک اور قلم بغیر نِب کے تھا۔ درست/ غلط

(ہ) شاکر خاں کے بھائی کو موسیقی سے نفرت تھی۔ درست/ غلط

۵۔ سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے:

(الف) دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ.............................کون سی نعمت چاہتا ہے؟

(ب) بادلِ نخواستہ مَیں ....مَیں لکھ رہا تھا۔

۶۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب اور محاورات کو اپنے الفاظ میں استعمال کیجیے:

لفظ بہ لفظ، نحیف ونزار، زندگی دوبھر ہونا، نچلا نہ بیٹھنا، کلیجے پر پتھر رکھنا، شایانِ شان، ماتھا ٹھنکنا، رَطبُ اللّسان

جملہ اِسمیہ اور جملہ فعلیہ کی ترکیبِ نحوی:

کسی جملے کے اجزا الگ الگ کرنے اور ان کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنے کو ترکیبِ نحوی کہتے ہیں۔

ترکیبِ نحوی کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جملہ، جملہ اِسمیہ ہوتا ہے یا جملہ فعلیہ۔ اگر کسی شعر یا مصرعے کی ترکیبِ نحوی کرنا مقصود ہو تو اسے نثر میں تبدیل کرتے ہیں۔ ان کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے:

جملہ اِسمیہ: فعلِ ناقص، مبتدا، خبر اور متعلق خبر۔

جملہ فعلیہ: فعلِ تام، فاعل، مفعول اور متعلق خبر۔

مثالیں: احمد ہوشیار ہے............اس میں ''ہے'' فعلِ ناقص، ''احمد'' مبتدا اور ''ہوشیار'' خبر ہے۔

شاہد اور امان حاضر تھے............اس جملے میں ''تھے'' فعلِ ناقص ہے، ''شاہد اور امان'' مبتدا اور ''حاضر'' خبر ہے۔

اب جملہ فعلیہ کی مثال دیکھیے:

جمیلہ کتاب پڑھتی ہے۔

''پڑھتی ہے''فعل ''جمیلہ'' فاعل ہے اور ''کتاب'' مفعول ہے۔

اقبال نے مون مارکیٹ سے نیا قلم خریدا۔

''خریدا''فعل، ''اقبال'' فاعل، ''نے'' علامتِ فاعل، ''مون مارکیٹ'' مجرور اور ''سے'' حرفِ جار۔

''مون مارکیٹ سے''متعلق فعل، ''نیا'' صفت، ''قلم'' موصوف، ''نیا قلم'' مفعول۔ یہ جملہ فعلیہ ہے۔

۸۔ اب آپ درجِ ذیل جملوں اور مصرعوں کی ترکیبِ نحوی کیجیے:

(الف) شاہ رُخ اسلم کا بھائی ہے۔

(ب) شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

(ج) تندرستی ہزار نعمت ہے۔

(د) رافعہ اور مومنہ کتابیں خریدنے گئیں۔

(ہ) شہریار بیمار ہے۔

افسانہ

یہ اُس فرضی کہانی کو کہتے ہیں جو مختصر، دل چسپ اور واقعاتی لحاظ سے زندگی کے کسی پہلو پر روشنی ڈالے۔ اس کے کردار فرضی ہوتے ہیں لیکن حقیقی نظر آتے ہیں۔ اس کی طوالت اتنی ہوتی ہے کہ ایک نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ وحدتِ تاثّر اس کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ دوستی کے موضوع پر دو دوستوں کے درمیان مختصر مکالمہ تحریر کریں۔

۲۔ دوستی کے حق اور مخالفت میں جماعت کے کمرے میں ایک مباحثہ کرایا جائے۔ اس میں دونوں طرف سے تین تین طلبہ دلائل دیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ پر دوستی کا صحیح مفہوم واضح کیا جائے۔

۲۔ مختلف مثالوں کے ذریعے سے طلبہ کو وقت کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔

۳۔ طلبہ پر واضح کیا جائے کہ اپنے من پسند کام میں مصروف رہنے ہی سے انسان خوش رہ سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور
(۱۹۲۹ء-۲۰۱۲ء)

ہاجرہ مسرور لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ڈاکٹر تہوّر علی خاں سرکاری ملازم تھے۔ والد کے تبادلوں کی وجہ سے ان کی تعلیم کئی شہروں میں ہوئی۔ ان کی اچانک وفات کے بعد ہاجرہ کا سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا۔ ہاجرہ مسرور کو گھر میں ادبی ماحول میسر تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ سے ہجرت کر کے لاہور آگئیں۔ کچھ عرصہ وہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ رسالہ نقوش کی ادارت میں شریک رہیں۔ ان کی شادی معروف صحافی احمد علی (مدیر: ڈان) سے ہوئی۔

خواتین افسانہ نگاروں میں ہاجرہ مسرور نے خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع خواتین کے مسائل اور چھوٹی بڑی معاشرتی الجھنیں ہیں۔ معروف افسانہ نگار اور نقاد ممتاز شیریں لکھتی ہیں: ''اتنی زیادہ تعداد میں اچھے افسانے ہاجرہ مسرور کے علاوہ شاید ہی کسی نے لکھے ہیں۔''

ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً: چرکے، ہائے اللہ، چوری چھپے، اندھیرے اُجالے، تیسری منزل وغیرہ۔ وہ لوگ کے نام سے ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ہاجرہ کے افسانوں کا کلیات سب افسانے میرے ۱۹۹۱ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ہاجرہ مسرور بھرپور ادبی اور سماجی زندگی گزار کر ۱۵ ستمبر ۲۰۱۲ء کو کراچی میں وفات پا گئیں اور کراچی ہی میں دفن ہوئیں۔

مُلمّع

تدریسی مقاصد

۱۔ ہاجرہ مسرور کی افسانہ نگاری کا تعارف کرانا۔
۲۔ معاشرے میں ظاہر و باطن کے دوغلے پن کی نشان دہی کرنا۔
۳۔ بعض لوگوں کو دکھاوے کی عادت ہوتی ہے، اس کے نفسیاتی پس منظر کی نقاب کشائی کرنا۔
۴۔ طلبہ کو افسانے کی صِنف سے واقفیت دلانا۔
۵۔ طلبہ پر اچھے افسانے کی خوبیاں اُجاگر کرنا۔

وہ ریلوے ٹکٹ گھر کے سامنے سیاہ ریشمی برقعے میں لپٹی کھڑی تھی۔ پلٹی ہوئی نقاب، کچھ متعجب سی نگاہیں، رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ گاڑی کے آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے، لیکن ٹکٹ گھر کی کھڑکیاں اب تک بند تھیں۔ اس کی حیران نظریں بند کھڑکیوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اُکتا گئیں۔ اس نے ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی۔ زمین اور بنچوں پر سیکڑوں آدمی لاشوں کی طرح پڑے سو رہے تھے، جیسے ان سب کو سفر کرنا ہی نہ تھا۔

وہ آہستہ سے قلی کی طرف مڑی، جو اس کا ہلکا پھلکا اٹیچی کیس اور مختصر سا بستر سر پر رکھے ہوئے تھا۔

''قلی! اب تک ٹکٹ گھر نہیں کھلا؟''

''یو گاڑی ہمیشہ لیٹ رہت ہے۔'' قلی نے اپنی دھندلی سی تنہا آنکھ اس کے خوب صورت چہرے پر گاڑ دی اور جیسے اس کی دوسری پھوٹی ہوئی آنکھ کا دھنسا ہوا پپوٹا اپنی بے مائگی پر پھڑکنے لگا۔

''تو کہاں بیٹھوں مَیں؟'' وہ جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر قریب پڑے ہوئے غریب انسانوں پر اپنی نظریں بکھیر دیں۔

''یہیں بیٹھ جاؤ۔''

''یہاں؟'' اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ریشمی برقع، خوب صورت چہرہ اور نفیس سامان، غریب قلی کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا اور وہ خاموشی سے نیم تاریک سی کالی کلوٹی سڑک کی طرف دیکھنے لگی، جس پر اِکّا دُکّا چرخ چوں کرتے ہوئے یکّے کی میلی چمنیوں والی بتیوں سے ایک کثیف سی روشنی نکل کر سڑک پر رینگ رہی تھی۔ اس کا خیال فوراً ہی

اپنی موجودہ حالت کی طرف دوڑ گیا۔ مَیں کیا ہوں اس وقت؟ دیکھنے والوں کی نظر میں یقیناً کوئی امیر کبیر آزاد خیال لڑکی لیکن درحقیقت ایک مٹے ہوئے خاندان کی قابل...... لیکن پریشان حال لڑکی۔ بالکل یکّے کی دھندلی لالٹین۔

''رکھے دیت ہیں سامان اسی جگہ۔'' قلی بولا۔

''نہیں مَیں یہاں نہیں بیٹھوں گی۔'' اس نے کسی قدر غصّے سے کہا۔ پھر اندھیرے میں گھورنے لگی۔ اندھیری سڑک پر کرارے بوٹوں کی چِرَ رُ چِرَ رُ پیدا ہوئی اور ایک سایہ لرزتا ہوا بڑھنے لگا۔ آخر سٹیشن کی تیز روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک قبول صورت نوجوان ایک بھاری اووَرکوٹ پہنے اسی طرف آ رہا ہے۔ لڑکی سمجھی شاید ٹکٹ لینے آ رہے ہیں حضرت۔ وہ بے ساختہ مسکرادی۔ نوجوان ٹائی کی گرہ کستا، اس پر ایک چبھتی ہوئی نظر ڈالتا ٹکٹ گھر کے پیچھے نکل گیا۔

لڑکی کے کھلے ہوئے لب سُکڑ گئے۔ ہوگا کوئی امیر زادہ! بھلا وہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کیوں آئے گا؟

''پھر ہم سامان رکھ کے جائیت ہیں۔'' قلی لڑکی کی خاموشی سے جھنجھلا کر بولا۔

''بکومت! مَیں یہاں ہرگز نہ بیٹھوں گی۔'' وہ اونچی آواز میں بول اٹھی۔

اچانک وہی نوجوان ٹکٹ گھر کے پیچھے سے نکل آیا۔

''قلی! تم زنانہ انٹر کلاس ویٹنگ روم میں کیوں نہیں لے جاتے؟'' وہ بولا۔

''پھر اتنی دُور ٹکٹ لینے کون آئے گا؟'' لڑکی قلی سے ہی مخاطب تھی۔

''ٹکٹ سیکنڈ کا چاہیے یا اِنٹر کا؟'' نوجوان بھی جیسے قلی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے سنّاٹے میں آ گئی۔

''قلی! چلو!'' وہ بڑے رعب سے کہنے لگی۔

آگے آگے قلی تھا اور پیچھے پیچھے وہ۔ اس کی اونچی ایڑی کی سینڈل زمین پر ایک دل چسپ شور بکھیر رہی تھی۔

''مجوری میم صاحب!'' قلی نے اس کے چرمی بٹوے سے متاثر ہو کر کہا۔

''ابھی نہیں ملیں گے پیسے۔'' وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی، جنوری کی کپکپا دینے والی سردی میں رومال سے پیشانی پونچھ رہی تھی۔

''کا ہے؟'' قلی کے موٹے موٹے ہونٹ لٹک گئے۔

''اکٹھے لے لینا، سمجھے تم! گاڑی پر سامان بھی رکھوا دینا اور دیکھو! جیسے ہی ٹکٹ گھر کُھلے، مجھے بتانا آکر۔ پیسے زیادہ ملیں گے۔''

قلی اپنے ناریل جیسے سر پر پگڑی لپیٹتا چلا گیا اور لڑکی بجائے بیٹھنے کے مضطربانہ ٹہلنے لگی۔ سامنے بنچ پر کوئی کمبل میں لپٹا کُلبلا رہا تھا۔

عجیب مصیبت ہے! وہ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ یہ کم بخت مرد ہر موقع پر آ دھمکتے ہیں۔ کچھ نہیں تو سیکنڈ اور انٹر کا شوشہ ہی چھوڑ دیا۔ اب اسے کیا معلوم کہ اس نے اس وقت جو کچھ میرے پاس دیکھا، بس یہی میری کل کائنات ہے۔ اٹیچی کیس اور ہولڈال اچھے زمانے کی یادگار ہیں۔ چرمی بٹوا، ایک سہیلی کا تحفہ اور یہ برقع چلتے وقت خالہ جان کا مانگ لیا تھا کہ مسافر عورتیں میلے کچیلے برقعے والیاں، دیکھتے ہی پھیل پھیل کر بیٹھ جاتی ہیں۔

آج ہی دوپہر کو تو چچا جان کی بیماری کا خط ملا تھا۔ امّی جان کا خیال ہے کہ اگر گھر سے کوئی انھیں دیکھنے چلا جاتا تو اچھا تھا، ورنہ وہ یہی کہیں گے کہ ہم نے تو بھائی کے مرنے کے بعد بھاوج اور بھتیجے بھتیجیوں کا اتنا خیال کیا کہ پیسے کو پیسا نہ سمجھا لیکن وہی بُرے وقت کے ساتھی نہیں۔ بس وہ اتنا ہی سُن کر جانے کو تیار ہوگئی۔ امّی جان نے جانے کب سے تین روپے جوڑ کر رکھے تھے، سو نکال کر دیے کہ تم عقیل کو ساتھ لے کر چلی جاؤ۔ عقیل بچہ ہی سہی لیکن ہے تو لڑکا۔ بس یہی ان کی بات تو مجھے زہر معلوم ہوتی ہے۔ جانے وہ لڑکیوں کو کیا سمجھتی ہیں۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ مَیں کیا کوئی لڈو پیڑا ہوں، جو کوئی کھالے گا اور عقیل کو دیکھ کر ڈر کے مارے اُگل دے گا۔ آخر سلمٰی اور رضیہ بھی تو لڑکیاں ہیں۔ کیسے مزے میں تنہا سفر کیا کرتی ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ بھئی! وہ بڑے آدمی کی لڑکیاں ہیں۔ مَیں نے جواب دیا: واہ! تب تو انھیں بلا مبالغہ ایک درجن نوکروں کے جھرمٹ میں سفر کرنا چاہیے چونکہ ہم غریب ہیں، اس لیے ایک ہی کا سفر خرچ نکلنا مشکل ہے۔ کجا ایک ننھے محافظ کے ساتھ، جس کی حفاظت خود مجھ پر فرض ہوگی۔ غرض گھنٹوں ان سے بحث کی، تب کہیں جا کر عقیل صاحب کے پہرے سے نجات ملی۔

کھانسی کی کھوں کھوں سے وہ چونکی۔ کمبل کی گٹھڑی کھلی اور ایک جھریوں کا مارا بگلے کے پر جیسے سفید بالوں کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی فراک، ترشے ہوئے بال اور ٹرنک پر رکھے ہوئے ہیٹ سے کوئی عیسائی بڑھیا معلوم ہو رہی تھی۔

لڑکی نے ایک سخت تنقیدی نگاہ اس سوکھی مونڈی بڑھیا پر ڈالی اور پھر دل ہی دل میں اس خشک ساتھ پر افسوس کرنے لگی۔ کاش اس پوکھر کے پانی کی طرح ساکت بڑھیا کے بجائے کوئی سمندر کی سی بے چین نوجوان لڑکی یہاں ہوتی، جو اس کے ریشمی سیاہ برقعے میں دمکتے ہوئے چہرے کو رشک سے دیکھتی۔

قلی نے اندر آ کر لڑکی کو بتایا کہ ٹکٹ گھر کھل گیا ہے۔ لڑکی اٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔ راستے میں وہ برابر اِدھر اُدھر دیکھتی جاتی کہ کہیں وہ نوجوان اسے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیتے نہ دیکھ لے۔ کیا کہے گا اپنے دل میں وہ، لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ لڑکی نے اطمینان سے ٹکٹ لے لیا۔

چیختی چنگھاڑتی ہوئی گاڑی پلیٹ فارم کے سینے میں درآئی۔ جب لڑکی قلی کے پیچھے پیچھے ویٹنگ روم سے نکلی، تو اس کی پہلی نظر اسی نوجوان پر پڑی، جو بڑی شان سے سگریٹ مُنہ میں دبائے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''اب کیا ہو؟'' وہ سوچتی ہوئی جلدی جلدی آگے بڑھنے لگی۔ وہ زنانہ ڈبے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ عورتوں کی کاؤں کاؤں اور زیورات کی جھنکار، یا جیسے عادی مجرم قیدیوں کی ہائے ہائے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی تال پر۔ اس پر طُرفہ، مردوں کی ان کو ہدایتیں۔ ''مُنّی کی اماں! سامان نہ کھونے پائے'' ایک دوسرے آدمی اس قیامت کے موقعے پر گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے:

''خبردار! نقاب نہ کھلنے پائے۔''

لڑکی کا قلی دروازے پر اڑے ہوئے مردوں کے درمیان سے نکل کر ڈبے میں داخل ہونے کی فکر کر رہا تھا کہ پیچھے سے عورتوں اور مردوں کی ایک اور ٹولی اس بھرے ہوئے ڈبے پر حملہ آور ہوئی اور لڑکی بے چاری بیچ میں پھنس کر رہ گئی۔ اس ٹولی کی ایک عورت نے اپنا چاندی کی چوڑیوں میں پھنسا ہوا ہاتھ برقعے کی گُدڑی سے نکالا اور لڑکی کو راستے میں حائل دیکھ کر دھکّا دے دیا۔ لڑکی ایک جھکولا کھا کر سنبھل گئی۔ اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ وہ اس عورت کا جھالروں سے مزیّن برقع نوچ کر بھاگ جائے یا پھر اسے ریل کے نیچے دھکا دے دے لیکن سامنے جو دیکھا تو وہی نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ارے قلی! تم مجھے یہاں کیوں لائے؟'' وہ پوری طاقت سے چلاّئی اور قلی کو لے کر کسی طرح اس ہجوم سے نکل کر دوبارہ پلیٹ فارم کی پیمائش کرنے لگی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سیکڑوں میلے کچیلے بُرقعے غباروں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ کاش! وہ بھی ایک ایسا ہی برقع اوڑھے ہوتی تو کوئی اس پر طنز سے مسکرانے والا نہ ہوتا: اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ آرزو پھڑ پھڑانے لگی۔ وہ ہر پھر کر بلا مقصد ہی درجوں پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی تھی۔

فرسٹ، سیکنڈ، اِنٹر، زنانہ اِنٹر وہ دفعتاً تھم گئی۔ ایک بار عبارت کو پھر پڑھا اور یہ درجہ اسے موسلا دھار بارش میں کسی گھنے درخت کا سایہ معلوم ہونے لگا۔ وہ بلا سوچے سمجھے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ قلی باہر ہی متعجب سا کھڑا تھا۔

''لے آؤ سامان!'' وہ ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ قلی سامان رکھ کر اسے ایک آنکھ سے گھورنے لگا، جیسے وہ اس کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہو۔ لڑکی بھانپ گئی۔ اس نے بٹوا کھولا اور ایک چمکتی ہوئی اُٹھنّی اس کی طرف بڑھا دی۔ قلی کا چہرہ، جو حقارت کے جذبات کے باعث بری طرح لٹکا ہوا تھا، ایک دم کِھل اُٹھا۔ مزدور کو مزدوری چاہیے، اسے کسی کے معاملات سے کیا غرض؟ اس نے اُٹھنّی کو مَل کر دیکھا، جیسے وہ یقین کرنا چاہتا ہو کہ واقعی اس ہلکے پھلکے اسباب کی اٹھوائی آٹھ آنے بھی ہو سکتی ہے!

سیٹی کی آواز سن کر قلی اتر گیا اور پھر لڑکی کے عنابی ہونٹوں پر ایک مطمئن مسکراہٹ لہرانے لگی۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے کھڑا اسے میٹھی میٹھی نظروں سے تاک رہا ہے۔

گاڑی کو جُنبش ہوئی اور وہ دوڑ کر آگے چلا گیا۔ سٹیشن کی دُکانیں، خوانچے والے اور قلی اس کی نظروں کے سامنے سے بھاگ رہے تھے۔ وہ دیر تک کھڑی سٹیشن کی بتیوں کو، جو اب اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں، گھورتی رہی۔ آخر گُھپ اندھیرے میں اس کی نظریں ٹھوکریں کھانے لگیں۔ اب وہ اپنے ڈبے کی طرف متوجہ ہوئی۔ دو سیٹوں پر دو عورتیں رنگین لحافوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان کے اردگرد بھاری بھاری بکس اور بڑی بڑی پوٹلیاں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ کسی کے بیٹھنے کی جگہ ہی نہ تھی۔ تیسری سیٹ پر کونے میں ایک عورت بالکل دُبلی پتلی بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس کے قریب ایک دوسرا بچہ، جو زیادہ سے زیادہ دو سال کا ہوگا، بیٹھا منمنا رہا تھا۔ بالکل سوکھا، ہاتھ پاؤں کی کھال لٹکی ہوئی، جیسے وہ پیدائش کے بعد فوراً ہی براہِ راست بڑھاپے کی طرف چل دیا ہو۔

ڈبے پر عجیب اِضمحلال طاری تھا۔ لڑکی بددل ہو کر اسی سیٹ پر ٹک گئی۔

ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی رُکی اور لڑکی کا دل پسلیوں سے سر ٹکرانے لگا۔ اگر کوئی اس وقت اس کا ٹکٹ دیکھے تو! اسے پُھریریاں آنے لگیں۔ دو منٹ بعد گاڑی چل دی اور لڑکی سوچنے لگی۔

آخر اس مُلَمّع سے کیا فائدہ، جو ذرا سی رگڑ سے اتر جائے۔ دنیا میں امیر غریب سبھی تو ہیں، بھلا ایک قیمتی اوور کوٹ والے نوجوان سے اس قدر متاثر ہونے کی کیا وجہ؟ آسمان پر صبح کی روشنی رینگتی جا رہی تھی اور تارے سہمے سے کانپ رہے تھے۔ گاڑی کسی اَور سٹیشن پر رکی۔ لڑکی نے دروازے سے سر نکال کر سٹیشن کا نام پڑھا۔ اب اس کی منزلِ مقصود قریب تھی۔

سوئی ہوئی عورتیں اُٹھ بیٹھیں۔ وہ آپس میں جمائیاں لے لے کر کسی دوسرے صوبے کی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی لڑکی کی طرف متوجہ نہ ہوئی، جیسے وہ اپنے کالے چہروں کے سامنے اس کے کالے برقعے کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھتی تھیں۔ لڑکی نے اپنا اسباب دروازے کے قریب گھسیٹ لیا، کیوں کہ آیندہ سٹیشن پر اسے اُترنا تھا۔ گاڑی رُکی اور اس نے جلدی سے اپنا بستر پلیٹ فارم پر لڑھکا دیا۔ پھر اٹیچی کیس لے کر اتر گئی۔ چھوٹا سا سٹیشن۔ گاڑی صرف دو منٹ ٹھیرتی تھی۔

ٹرین نے سیٹی دی اور وہ اس نوجوان پر ایک اَلوداعی نظر ڈالنے کے لیے رُکی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یقیناً کسی اگلے سٹیشن پر اترے گا۔ وہ بہت خوش تھی، اس لیے کہ اس نے مفلسی کو اس امیر نوجوان سے چھپا لیا تھا، لیکن وہ یہ دیکھ کر سنّاٹے میں آ گئی کہ وہ نوجوان اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا ٹرین میں بیٹھے ہوئے آدمی سے الوداعی مصافحہ کر رہا تھا۔ لڑکی گھبرا کر قلی کو پکارنے لگی۔ ایک بڈھا آنکھیں ملتا ہوا، بڑھا اور اس کا سامان اٹھا کر چلنے لگا۔ کتنا عجیب اتفاق تھا! جہاں وہ اُتری، وہیں اسے بھی اترنا تھا۔ لڑکی تقریباً بھاگنے لگی، اس لیے کہ اب وہ نوجوان سے پہلے گیٹ پاس کر کے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ اس کی نظر سے چُھپانا چاہ رہی تھی، لیکن جب وہ گیٹ کے قریب پہنچی تو وہ نوجوان گیٹ سے باہر کھڑا اسے آتا دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لیے لڑکی کا ہاتھ بڑھتا ہی نہ تھا۔ اس وقت

ٹکٹ اس کے ہاتھ میں ایک من کا بوجھ تھا۔ وہ ایک لمحہ تک تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی، آخر اسے ٹکٹ دیتے ہوئے شکست مان لینا پڑی۔ وہ مضمحل قدموں سے باہر نکلی۔ اس وقت اس کی حالت اس شخص کی سی تھی، جس نے اپنے کپڑوں پر پانی کی ایک چھینٹ پڑے بغیر دریا پار کر لیا ہو لیکن کنارے پر پھسل کر پانی میں شرابور ہو جائے۔ اسے اب نوجوان کہیں نظر نہ آیا۔ شاید وہ اس کی نگاہوں میں اب کوئی درجہ نہ رکھتی تھی۔ یہ احساس اس کے سینے کو بر مار رہا تھا۔ وہ تانگے پر بیٹھ کر رو دی۔

چچا کے ہاں اس کا استقبال صرف اس لیے بڑی گرم جوشی سے کیا گیا کہ اس نے بیمار چچا کی عیادت کے لیے تنہا سفر کیا تھا لیکن وہ ان گرم جوشیوں کے مقابلے میں بہت سرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چائے کی ایک پیالی بہت اصرار پر کڑوی دوا کی طرح پی اور کوٹھے پر دھوپ کھانے چلی گئی۔ اس کے پیچھے چچا زاد بہن بھی آ گئی۔

''باجی! یہ برقع تو بڑا اچھا سا بنا ڈالا تم نے۔'' وہ اس کا برقع بھی نیچے سے مارے شوق کے اٹھاتی لائی تھی۔

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ سورج کے رُخ پر کھڑی ہو کر برقعے کو قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر لمبی چوڑی چھت پر مضطربانہ ٹہلنے لگی۔ اسے برقعے کی تعریف ہوتے ہی سفر کے سارے واقعات رہ رہ کر یاد آنے لگے، جنھیں وہ اپنے دل سے محو کر دینا چاہتی تھی۔

اس کی بہن برقع پہن کر کھڑی ہو گئی۔

''کتنا اچھا لگتا ہے! مَیں بھی بالکل ایسا ہی بنواؤں گی۔'' وہ ہر اچھے کپڑے کو دیکھ کر خود بھی ویسا ہی بنوانے کو کہا کرتی تھی، لیکن شاید ہی وہ کبھی ایسا کر سکی ہو۔

لڑکی ٹہلتے ٹہلتے اپنا خیال بٹانے کے لیے پڑوس کے مکان میں جھانکنے لگی۔ اُس نے دیکھا۔

گوبر سے لپے پُتے آنگن میں بانس کی کُھری چارپائی پر کوئی تہبند باندھے اوندھا پڑا دھوپ لے رہا تھا۔ چارپائی پر سرہانے کی طرف بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی۔ پھونس کے چھپر میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں تھوپ رہی تھی۔

دھوپ کھانے والے نے کروٹ بدلی اور لڑکی کا دل دھڑکتے دھڑکتے جیسے ایک لمحہ کے لیے تھک گیا ہو۔

وہی سٹیشن کا امیر زادہ! اچانک دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ نوجوان نے پُھرتی سے کروٹ بدل لی۔

چھپّر میں ایک کھونٹی پر قیمتی اوورکوٹ جھول رہا تھا۔

''بٹو! اس مکان میں کون رہتا ہے اب؟'' لڑکی نے اپنی بہن سے سوال کیا، جو برقع پہنے اب تک یہی معلوم کر رہی تھی کہ وہ کیسی لگتی ہے؟

''ایک بیوہ! اور اس کا ایک لڑکا بھی ہے۔ شہر میں پڑھتا ہے۔ باجی! بے چاری بڑی سیدھی عورت ہے۔ ہمارے ہاں کے سارے کپڑے یہی سیتی ہے لیکن سچ مانو، سلائی بہت کم لیتی ہے۔''

لڑکی سورج کے رخ پر کھڑی بر فتے کو گھور رہی تھی۔

(سب افسانے میرے)

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے:

(الف) قلی نے لڑکی کو پلیٹ فارم پر بیٹھ جانے کے لیے کہا تو اس پر لڑکی نے کس رویّے کا اظہار کیا؟

(ب) لڑکی سفر کیوں کر رہی تھی؟

(ج) گھر والوں نے عقیل کو ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا تو اس پر لڑکی نے کیا جواب دیا؟

(د) لڑکی سٹیشن پہنچی تو اس نے سب سے پہلے کیا دیکھا؟

(ہ) لڑکی جس ڈبے میں سوار ہوئی، اس کا ماحول کیسا تھا؟

۲۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق ''ملمع'' کے مآخذ کا نام کیا ہے؟

(i) وہ لوگ (ii) سب افسانے میرے

(iii) ہائے اللہ (iv) چوری چھپے

(ب) جب لڑکی ریلوے سٹیشن پہنچی تو گاڑی آنے میں کتنی دیر تھی؟

(i) پندرہ منٹ (ii) آدھا گھنٹا

(iii) ایک گھنٹا (iv) چند منٹ

(ج) سبق ''مُلَمَّع'' اصنافِ ادب کے لحاظ سے کیا ہے؟

(i) داستان (ii) افسانہ

(iii) مضمون (iv) ناول

(د) ''مُلمّع''، کس کی تحریر ہے؟

(i) خدیجہ مستور (ii) ہاجرہ مسرور

(iii) سجاد حیدر یلدرم (iv) اشرف صبوحی

(ہ) لڑکی نے قلی کو کتنی رقم دی؟

(i) اُٹھنّی (ii) ایک روپیا

(iii) پانچ کا نوٹ (iv) دس روپے

(و) لڑکی کے سفر کا مقصد تھا:

(i) سیر سپاٹا (ii) بیمار چچا کی عیادت

(iii) خالہ زاد بہن کی شادی میں شرکت (iv) چھٹیاں گزارنا

(ز) لڑکی نے ریل کا سفر کس درجے میں کیا؟

(i) انٹر (ii) اوّل

(iii) دوم (iv) اے سی

۳۔ لڑکی پر امیر زادے کی اصلیت کیسے واضح ہوئی؟

۴۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

	درست	غلط
(الف) ''گاڑی ہمیشہ لیٹ رہتی ہے۔'' قلی نے کہا۔	....	....
(ب) لڑکی کو ماموں کی بیماری کا خط ملا تھا۔	....	....
(ج) قُلی ایک روپے کا سکّہ پا کر خوش ہو گیا۔	....	....
(د) چچا کے ہاں لڑکی کا استقبال خوشی سے کیا گیا۔	....	....

۵۔ اردو میں اسم کی بلحاظِ جنس دو قسمیں ہیں، مذکّر اور مؤنث۔ یعنی ہر اسم، چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، مذکر ہو گا یا مؤنث۔ اگر چہ ماہرینِ قواعد نے تذکیر و تانیث کے کچھ اصول بنائے ہیں لیکن عام طور پر تذکیر و تانیث اہلِ زبان کے بول چال ہی کے تابع ہوتے ہیں اور بے جان اسموں کی تذکیر و تانیث کے سلسلے میں بھی اہل زبان کی گفتگو ہی سند قرار پاتی ہے۔

مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

برقع، قلی، سڑک، لالٹین، لب، پیشانی، فرض، سائنس، گُدڑی

۶۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۷۔ سبق ''ملمع'' کا سیاق وسباق ذہن میں رکھ کر درجِ ذیل نثر پاروں کی تشریح کیجیے:

(الف) ارے قلی! تم مجھے ________ عبارت پڑھ رہی تھی۔

(ب) لڑکی کا قلی دروازے پر ________ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

۸۔ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان دسیوں زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ایک زمانے تک اس پر فارسی اور عربی الفاظ کا غلبہ رہا۔ اب کچھ عرصے سے انگریزی الفاظ بھی تیزی سے اس کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ آپ اس افسانے میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کریں۔

سرگرمیاں

ا۔ اس افسانے میں آپ کا پسندیدہ کردار کون سا ہے؟ اپنے لفظوں میں اس کا تعارف کرائیں اور پسندیدگی کی وجہ بھی لکھیں۔

۲۔ ہاجرہ مسرور کا کوئی اور افسانہ جماعت میں پڑھ کر سنائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

ا۔ ہاجرہ مسرور کا تعارف کرایا جائے۔

۲۔ طلبہ کے سامنے اچھے افسانے کے پلاٹ، کردار، فضا اور دیگر فنی لوازم کی وضاحت کی جائے۔

۳۔ طلبہ کو افسانے کی بالعموم اور اس افسانے کی بالخصوص اہم خصوصیات بتائی جائیں۔

شفیع عقیل

(۱۹۳۰ء۔۲۰۱۳ء)

شفیع عقیل لاہور کے قریب واقع ایک گاؤں تھینہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معروف صحافی، ادیب اور شاعر تھے۔ ناساز گار حالات کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ملازمت کے ساتھ ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحان پاس کیے۔ بیس سال کی عمر میں لاہور سے کراچی چلے گئے اور مجید لاہوری کے رسالے ''نمک دان'' سے وابستہ رہے۔ بعدازاں ''اخبارِ جہاں'' اور روزنامہ ''جنگ'' سے منسلک ہو گئے۔

ان کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ ان کے تراجم ایسے ہیں کہ ان پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کا زیادہ تر کام لوک داستانوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے لوک کہانیوں کے تراجم بھی کیے۔ مختلف لوک داستانوں کو اُردو میں منتقل کر کے اُنھوں نے ایک بڑی ثقافتی اور علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔

ان کی تصانیف و تالیفات میں پنجاب کی لوک کہانیاں، پنجابی لوک داستانیں، چینی لوک کہانیاں، جاپانی لوک کہانیاں، ایرانی لوک کہانیاں، پیرس پھر پیرس ہے، مجید لاہوری، ادبی مکالمے اور ہماری منزل: غازی یا شہید شامل ہیں۔ ان کی ایک تصنیف پنجاب رنگ پر انھیں رائٹرز گلڈ کی طرف سے انعام بھی ملا۔ آپ کراچی میں مقیم اور بطورِ صحافی روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ تھے۔

چُغل خور

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ پر لوک داستان کا مفہوم واضح کرنا۔

۲۔ چغل خوری جیسی اخلاقی برائی کے دُور رس منفی سماجی نتائج کو واضح کرنا۔

۳۔ طلبہ کو باور کرانا کہ چغل خوری، فتنہ پروری، غیبت اور بدخُوئی، اَخلاقی اور اسلامی لحاظ سے قابلِ مذمّت افعال ہیں، اِن سے بچنا چاہیے۔

[اس سبق میں چغل خور کے بیانات جھوٹ کی ذیل میں آتے ہیں اور یہ چغل خوری کی بجائے فتنہ پروری زیادہ ہے۔...... یہ ایک لوک کہانی ہے۔ یہ لوک کہانیاں یا لوک داستانیں کسی معاشرے، تہذیب اور زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کے مصنف کا کسی کو اتا پتا نہیں ہوتا۔ یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ذریعے سے محبت، ایثار، خلوص، مروّت، اتحاد، دوستی اور بہادری جیسی صفات معاشرے میں پروان چڑھتی ہیں اور نسلوں کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔]

اگلے وقتوں کی بات ہے کسی گاؤں میں ایک چغل خور رہتا تھا۔ دوسروں کی چغلی کھانا اور ایک کی بات دوسرے سے کرنا اس کی عادت تھی اور لاکھ کوشش کے باوجود، وہ اپنی عادت کو نہ چھوڑ سکا تھا۔ اس نے بارہا اس بات کا ارادہ کیا کہ اب کسی سے کسی کی چغلی نہیں کھائے گا، ایک کی بات دوسرے سے نہیں کہے گا لیکن ہر بار وہ اپنے اس ارادے میں ناکام ہو جاتا۔ دراصل وہ اپنی عادت سے مجبور تھا اور اسی عادت کی وجہ سے اسے اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے، چنانچہ وہ بےکار تھا۔ اس نے دوسری ملازمت کی بہتیری کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ دن تک تو وہ اپنی جمع پونجی پر گزر بسر کرتا رہا لیکن جب تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا سارا سرمایہ ختم ہو گیا تو بہت پریشان ہوا۔ اس نے نوکری اور مزدوری کے لیے سرتوڑ کوشش شروع کر دی کہ کہیں فاقوں کی نوبت نہ آ جائے۔ مختلف لوگوں سے کہا، دردر کی خاک چھانی، ایک ایک کے پاس گیا مگر مصیبت یہ تھی کہ چغل خور ہونے کی وجہ سے اسے کوئی بھی اپنے پاس ملازم رکھنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی چغلی کھانے کی عادت کے بارے میں جانتے تھے، اس لیے اسے کوئی بھی مُنھ نہ لگاتا تھا۔ آخر جب وہ مسلسل ناکامیوں سے تنگ آ گیا اور نوبت واقعی فاقوں تک آ پہنچی تو اس نے دل میں سوچا: ''اس گاؤں کو چھوڑ دینا چاہیے اور کہیں اور چل کر قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔''

چنانچہ اس نے تھوڑا بہت ضروری سامان لیا اور گاؤں چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوگیا تا کہ کسی دوسرے گاؤں یا شہر میں جا کر محنت مزدوری کرے۔

چلتے چلاتے وہ ایک اور گاؤں میں جا پہنچا۔ یہ گاؤں اس کے لیے نیا تھا اور اسے وہاں کوئی نہیں جانتا تھا، اس لیے اسے امید تھی کہ یہاں نوکری مل جائے گی، لہٰذا وہ ایک کسان کے پاس گیا اور اس سے کہا: ''مجھے آپ اپنی ملازمت میں رکھ لیں۔''

کسان نے اس سے دریافت کیا: ''تم کیا کام کر سکتے ہو؟''

چغل خور نے جواب دیا: ''مجھے کھیتی باڑی کا سارا کام آتا ہے۔ یہ کام مَیں اچھی طرح کر سکتا ہوں۔''

اتفاق کی بات یہ کہ وہ کسان اکیلا تھا اور کھیتوں کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ اُسے ایک ملازم کی ضرورت بھی تھی، اس لیے اس نے سوچا، چلو اِسے ہی ملازم رکھ لیتا ہوں۔ یہ بھی ضرورت مند ہے اور میرا بھی کام ہلکا ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے چغل خور سے پوچھا: ''اگر مَیں تمھیں اپنے پاس ملازم رکھ لوں تو تم کیا تنخواہ لو گے؟''

اس پر چغل خور نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: ''کچھ نہیں! میری کوئی تنخواہ نہیں ہے۔''

کسان کو اس کی بات سن کر بڑا تعجّب ہوا کہ کام کرے گا اور تنخواہ نہیں لے گا۔ بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس نے حیرانی سے کہا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

جواب میں چغل خور کہنے لگا: ''آپ مجھے صرف روٹی کپڑا دے دیں اور اس کے ساتھ ایک بات کی اجازت! بس یہی میری تنخواہ ہے۔''

کسان پوچھنے لگا: ''کس بات کی اجازت؟''

چغل خور بولا: ''آپ مجھے صرف اتنی اجازت دے دیں کہ مَیں چھے ماہ کے بعد آپ کی صرف ایک چغلی کھا لیا کروں۔''

چغل خور کی یہ بات تو اپنی جگہ بڑی عجیب تھی لیکن کسان نے اپنے دل میں سوچا: ''مفت کا نوکر مل رہا ہے، خالی روٹی کپڑے میں کیا بُرا ہے؟'' پھر اُس نے اپنے آپ کو آمادہ کرنے کے لیے کہا: ''چھے ماہ بعد ایک چغلی کھاتا ہے تو کھالے، میرا کیا جاتا ہے؟ یہ کسی سے میری چغلی کھا کر میرا کیا بگاڑ لے گا؟ میرے پاس کون سے راز ہیں جو ظاہر ہو جائیں گے؟''

''مجھے تمھاری یہ شرط منظور ہے۔''

چنانچہ چغل خور کسان کے پاس ملازم ہوگیا۔ وہ کام بھی اُسی کا کرتا تھا اور اُسی کے گھر میں رہتا بھی تھا۔ روزانہ صبح سویرے کسان کے ساتھ کھیتوں میں چلا جاتا، بیلوں کے لیے چارا کاٹتا، ہل چلاتا، گاہی کرتا اور اس طرح کام میں کسان کا برابر کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

دن گزرتے گئے اور کسان کو یہ بات بھی بھول گئی کہ چھے ماہ بعد چغل خور نے ایک چغلی کھانے کی اجازت مانگی تھی اور اس

نے چغلی کھانے کی اجازت دے دی تھی۔ کسان اس عرصے میں یہ تمام باتیں بھول چکا تھا۔

اِدھر چغل خور کو کسان کے ہاں ملازم ہوئے چھے ماہ بیت چکے تھے اور اب اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی سے کسان کی کوئی چغلی کھائے۔ وہ چھے ماہ سے اب تک اپنی اس عادت پر جبر کیے ہوئے تھا مگر اب معاہدے کی مدّت ختم ہونے پر اپنے آپ پر قابو پانا اس کے بس میں نہ تھا، چنانچہ جب وہ اپنی عادت سے بالکل مجبور ہوگیا تو اس نے سوچا، اب چاہے کچھ ہو، مَیں کسان کی چغلی ضرور کھاؤں گا اور اب تو معاہدے کے مطابق میرا حق بھی ہے۔

ایک روز کسان حسبِ معمول اپنے کھیتوں میں گیا ہوا تھا اور گھر میں اس کی بیوی اکیلی تھی۔ یہ دیکھ کر چغل خور کسان کی بیوی کے پاس گیا اور بڑا ہمدرد بنتے ہوئے کہنے لگا: ''اگر تم بُرا نہ مانو تو مَیں تُم سے ایک بات کہوں؟''

کسان کی بیوی بولی: ''ضرور کہو! اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟''

چغل خور اور بھی زیادہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولا: ''اس میں تمھارا ہی بھلا ہے۔''

یہ سن کر کسان کی بیوی کو کچھ شک سا ہوگیا۔ اُس نے دل میں سوچا، ہو نہ ہو کوئی خاص بات ضرور ہے۔ یہی خیال کر کے وہ کہنے لگی: ''پھر تو ضرور کہو! وہ کیا بات ہے؟''

جواب میں چغل خور بڑے رازدارانہ انداز میں بولا: ''دراصل کسان کوڑھی ہوگیا ہے۔ اُس نے اپنی یہ بیماری اب تک تم سے چُھپا رکھی ہے۔''

''کوڑھی ہوگیا ہے؟'' کسان کی بیوی نے چونک کر پوچھا۔

اسے بڑا تعجّب ہوا۔ یہ بات اُس کے لیے جس قدر نئی تھی، اس سے کہیں زیادہ حیران کُن بھی تھی۔

چغل خور نے جب اپنا تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھا تو بولا: ''اگر تُمھیں یقین نہ آئے تو آزما کے دیکھ لو۔''

اب تو کسان کی بیوی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے دل میں سوچا، ہوسکتا ہے ملازم ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ بھلا اُس کو مجھ سے ایسا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ لٰہذا اس نے جلدی سے پوچھا: ''مگر مَیں کیسے آزماؤں؟''

چغل خور جھٹ سے کہنے لگا: ''اِس میں کیا مشکل ہے؟''

پھر اُس نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: ''جو آدمی کوڑھی ہو جائے اس کا جسم نمکین ہو جاتا ہے اگر تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ کسان کوڑھی ہوگیا ہے یا نہیں تو کسان کے جسم کو زبان سے چاٹ کر دیکھ سکتی ہو۔''

کسان کی بیوی کو چغل خور کی یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوچا، اس سے نوکر کے جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ اُس نے کہا: ''اچھا! کل جب مَیں کسان کا کھانا لے کر کھیتوں میں جاؤں گی تو کسان کے جسم کو چاٹ کر ضرور دیکھوں گی۔''

چغل خور کسان کی بیوی سے یہ باتیں کر کے سیدھا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جہاں کسان پہلے ہی سے کھیتی باڑی کے کاموں میں لگا ہوا تھا۔ دراصل اُن دنوں فصل پک چکی تھی، جس کی وجہ سے کسان دو روز سے اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ اُسے رات کو بھی

کھیتوں ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ چغل خور کسان کے پاس پہنچا اور اس سے بڑی راز داری سے کہنے لگا: ''تم اِدھر کھیتوں میں کام کرتے پھر رہے ہو اور اُدھر تمھاری بیوی پاگل ہوگئی ہے۔''

کسان بڑا حیران ہوا۔ اُس نے تعجب سے پوچھا: ''یہ تم کیا کہ رہے ہو؟''

چغل خور نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا: ''مَیں سچ کہ رہا ہوں، وہ تو پاگل پن میں آدمیوں کو کاٹنے دوڑتی ہے۔''

کسان سارا کام کاج چھوڑ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا، نوکر ٹھیک ہی کہ رہا ہوگا، بھلا اُسے کسی قسم کا جھوٹ بولنے کی کیا پڑی ہے؟ ہوسکتا ہے میری بیوی واقعی پاگل ہوگئی ہو۔ چغل خور نے جب کسان کو اس طرح شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو بولا: ''اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں تو کل جب وہ کھانا لے کر آئے، اس وقت دیکھ لینا۔''

اِس پر کسان کہنے لگا: ''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ آج رات تو مجھے کھیتوں ہی میں رہنا ہے، کل جب وہ کھانا لے کر آئے گی تو دیکھ لوں گا۔''

چغل خور نے جب یہ جان لیا کہ کسان اس کی باتوں میں آ گیا ہے تو وہاں سے چلا آیا اور کسان کے سالوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ان سے کہا: ''تم لوگ یہاں مزے کر رہے ہیں اور تمھارا بہنوئی تمھاری بہن کو روز مار مار کر اَدھ مُوا کر دیتا ہے۔ وہ اسے اس ظالمانہ طریقے سے مارتا ہے کہ مَیں بیان نہیں کر سکتا۔''

کسان کے سالوں نے چغل خور کی یہ بات سنی تو بہت پریشان ہوئے لیکن اُنھوں نے اس سے کہا: ''مگر ہماری بہن نے تو ہمیں یہ کبھی نہیں بتایا؟''

اس پر چغل خور بولا: ''وہ بے چاری شرم کے مارے تمھیں کچھ نہیں بتاتی، ورنہ اسے تو کسان اس بُری طرح مارتا پیٹتا ہے کہ وہ ہلکان ہو جاتی ہے۔ کھیتوں میں سب کے سامنے اس کی بے عزتی کرتا ہے۔''

''لیکن ہم تمھاری بات پر کیسے یقین کر لیں؟''

اس پر چغل خور جھٹ سے بول پڑا: ''اگر تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ مَیں جھوٹ کہ رہا ہوں تو کل دوپہر کو جب تمھاری بہن کھانا لے کر کھیتوں میں جائے گی، اس وقت تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا، کسان اسے کس طرح مارتا ہے۔''

کسان کے سالے یہ بات سن کر غصے میں تلملانے لگے۔ بھلا وہ اپنی بہن کی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے چغل خور سے کہا: ''اچھا کل ہم کھیت میں چُھپ کر یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھیں گے۔''

چغل خور وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا کسان کے بھائیوں کے پاس گیا اور ان سے جا کر کہا: ''بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم لوگ سب ایک ماں کے بیٹے ہو اور پھر بھی اپنے بھائی کی مدد نہیں کر سکتے۔''

کسان کے بھائیوں نے اس سے تعجب سے پوچھا: ''کیا ہوا؟ یہ تم کیا کہ رہے ہو؟ ہم کس کی مدد نہیں کرتے؟''

اس پر چغل خور نے رُوہانسا سا منہ بنا کر جواب دیا: ''تمھارا بھائی سخت مصیبت میں گرفتار ہے، اس کے سالے ہر چوتھے

روز آ کر اسے زدوکوب کرتے ہیں اور ایک تم ہو کہ تمھیں اس کی خبر تک نہیں۔ کسان کے بھائی یہ سن کر پریشان سے ہو گئے اور کہنے لگے: ''مگر ہمارے بھائی نے تو کچھ نہیں بتایا۔''

چغل خور بولا: ''وہ تم سے کیا کہے؟ بے چارہ اپنی شرافت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا اور خاموشی سے یہ بے عزّتی برداشت کر لیتا ہے۔''

جواب میں بھائی کہنے لگے: ''ہمیں تو تمھاری بات پر یقین نہیں آ رہا......!''

یہ سن کر چغل خور نے کہا: ''اگر تم لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں تو کل دوپہر کو آ کر اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لینا کہ کس طرح کسان کے سالے اسے مارتے ہیں۔''

کسان کے بھائی غصے میں تلملانے لگے۔ اُنھوں نے کہا: ''اچھا! ہم کل دیکھ لیں گے، وہ ہمارے بھائی کو کس طرح ہاتھ لگاتے ہیں۔ ابھی ہم مرے نہیں۔''

اس طرح چغل خور سب لوگوں سے یہ باتیں کہ کر واپس آ گیا اور اپنے کام کاج میں وہ اس طرح آ کر مصروف ہو گیا کہ کسی کو کانوں کان اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ کہاں گیا تھا اور کہاں سے آیا ہے۔

دوسرے روز دوپہر کو جب کسان کی بیوی کھانا لے کر کھیتوں میں آئی تو کسان نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی احتیاط سے اس کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہا تھا کیوں کہ اس کے دل میں تھا کہ کہیں پاگل ہونے کی وجہ سے وہ اسے کاٹ نہ کھائے، اس لیے وہ اس کے قریب ہونے سے ڈرتا تھا۔ دوسری طرف کسان کی بیوی کی یہ کوشش تھی کہ کسان کسی طرح اُس کے قریب ہو اور وہ اُس کو کاٹ کر یا اُسے زبان لگا کر دیکھ سکے کہ نمکین ہے یا نہیں۔ جوں ہی وہ چھاچھ کا مٹکا اور روٹیوں کی چنگیری زمین پر رکھ کر بیٹھی، کسان جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی بیوی بھی روٹیوں کی چنگیری آگے بڑھانے کے بہانے سے قدرے آگے سرک آئی اور پھر جوں ہی کسان نے روٹی پکڑنے کو ہاتھ آگے بڑھایا، اس نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے چاٹنے کے لیے آگے بڑھی۔ کسان اچھل کر دور ہٹ گیا۔ اب تو اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ واقعی اس کی بیوی پاگل ہو گئی ہے اور کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔

کسان کو نوکر کی کہی ہوئی بات سچ معلوم ہو رہی تھی۔ اُدھر اس کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ کسان اُسے جسم چاٹ کر دیکھنے نہیں دے رہا تو اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کسان واقعی کوڑھی ہو گیا ہے اور نوکر ٹھیک کہ رہا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر کسان کی کلائی پکڑنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر کسان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاؤں سے جوتا اُتار کر وہیں بیوی کی ٹھکائی شروع کر دی۔ جوں ہی اس نے بیوی پر جوتے برسانے شروع کیے، قریب ہی کھیت میں چھپے ہوئے کسان کے سالے باہر نکل آئے:

''واقعی نوکر ٹھیک کہ رہا تھا۔''

اُن کے سامنے اُن کی بہن کی پٹائی ہو رہی تھی، بھلا پھر وہ کیوں نہ یقین کرتے۔ وہ سارے کے سارے للکارتے ہوئے آگے بڑھے اور کسان پر ٹوٹ پڑے: ''آج دیکھتے ہیں، تم ہماری بہن کو کس طرح مارتے ہو!''

ان کا آگے بڑھنا تھا کہ دوسرے کھیت میں چھپے ہوئے کسان کے بھائیوں نے دیکھا: ''واقعی نوکر نے ہمیں صحیح اطلاع دی تھی۔''

انھوں نے جواب میں کسان کے سالوں کو للکارا: ''آج دیکھتے ہیں، تم ہمارے بھائی کو کس طرح مارتے ہو!''

اور اس کے بعد وہ سب ایک دوسرے پر پل پڑے۔ وہ سر پھٹوّل ہوئی، وہ لاٹھیاں چلیں کہ سب خون میں نہا گئے۔ آخر ارد گرد کے کھیتوں میں کام کرنے والے دوسرے لوگ بھاگ کر آئے اور انھوں نے بیچ بچاؤ کرا کے انھیں ایک دوسرے سے الگ کیا۔ پھر جب ان سب کا غصہ قدرے کم ہوا تو ان سے لوگوں نے پوچھا: ''تم لوگ اس طرح کیوں لڑ رہے تھے؟''

اس پر سب نے اپنی اپنی بات بتائی کہ یوں نوکر ہمارے پاس آیا تھا اور اس نے یہ بتایا تھا۔ اس طرح جب سب اپنی بات بتا چکے تو پتا چلا کہ:

یہ سب کچھ چغل خور کا کِیا دھرا ہے۔

وہ سارے کے سارے مل کر چغل خور کی تلاش میں چلے لیکن اس وقت تک چغل خور وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جا چکا تھا۔

کہتے ہیں وہ دن اور آج کا دن، چغل خور کا کہیں پتا نہ چل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی کوئی چغل خور یہ نہیں مانتا کہ وہ چغل خور ہے۔ دراصل اسے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ چغل خور ہے تو کسان، اس کے سالے اور اس کے بھائی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، اسی لیے ہر چغل خور، چغل خور کہنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔

(پنجابی لوک داستانیں)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) کسان نے چغل خور کو کن شرائط پر ملازم رکھا؟

(ب) چغل خور نے کسان کی بیوی کو کیا کہہ کر بدگمان کیا؟

(ج) ہر چغل خور کس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے؟

(د) چغل خور کو اپنی بُری عادت سے کیا نقصان اٹھانا پڑا؟

۲۔ لوک کہانی کی مختصر تعریف کیجیے۔

۳۔ سبق ''چغل خور'' کے متن کو سامنے رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق ''چغل خور'' مصنف کی کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

(i) پنجابی لوک داستانیں (ii) چینی لوک کہانیاں

(iii) پنجاب کی لوک کہانیاں (iv) جاپانی لوک کہانیاں

(ب) چغل خور کہاں رہتا تھا؟

(i) گاؤں میں (ii) قصبے میں

(iii) شہر میں (iv) بیرونِ ملک

(ج) اپنے گاؤں کو چھوڑ کر چغل خور کہاں پہنچا؟

(i) دوسرے گاؤں (ii) دوسرے شہر

(iii) بڑے قصبے (iv) دبئی

(د) چغل خور کون سا کام جانتا تھا؟

(i) لکڑی کا (ii) معماری کا

(iii) لوہے کا (iv) کھیتی باڑی کا

(ہ) چغل خور نے روٹی کپڑے کے علاوہ تنخواہ کے بجائے کیا رعایت مانگی؟

(i) چھے ماہ بعد ایک چغلی کھانے کی (ii) ہر عید پر دس چھٹیاں

(iii) ایک سو روپے (iv) دو سو روپے نقد اور ایک چغلی

(و) چغل خور نے کیا بتایا کہ کوڑھی کا جسم ہو جاتا ہے؟

(i) نمکین (ii) میٹھا

(iii) کھٹا (iv) کڑوا

(ز) چغل خور اس لیے نہیں مانتا کہ وہ چغل خور ہے کہ:

(i) اسے ملازمت نہیں ملتی (ii) وہ اسے جھوٹ سمجھتا ہے

(iii) کسان کے بھائیوں اور سالوں سے ڈرتا ہے (iv) اسے اپنی بے عزتی سمجھتا ہے

(ح) چغل خور کو چغل خور کہیں تو وہ:

(i) لڑ پڑتا ہے (ii) بھاگ جاتا ہے

(iii) ناراض ہو جاتا ہے (iv) شرمسار ہو جاتا ہے

۴۔ سبق ''چغل خور'' کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) چغل خور کھیتی باڑی کا کام جانتا تھا۔ درست/ غلط

(ب) چغل خور نے کسان کی بیوی کو بتایا کہ کسان کا جسم نمکین ہو گیا ہے۔ درست/ غلط

(ج) چغل خور نے کسان سے کہا کہ تمھاری بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ درست/ غلط

(د) کسان کے سالوں نے چغل خور کی چغلی کو جھوٹ جانا۔ درست/ غلط

(ہ) جب چغل خور کی اصلیت کھل گئی تو سب اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ درست/ غلط

۵۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھیں اور قوسین میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ چن کر خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) چغلی کھانا چغل خور کی ___________ ہوتی ہے۔ (فطرت، عادت، جبِلّت)

(ب) چغل خور نے کسان کی بیوی کو بتایا کہ وہ ___________ ہو گیا ہے۔ (باؤلا، کوڑھی، پاگل)

(ج) چغل خور نے کسان سے ______ بعد ایک چغلی کھانے کی اجازت مانگی۔ (ایک ماہ، چھے ماہ، نو ماہ)

(د) چغل خور کو چغل خور کہا جائے تو وہ ___________ ۔ (لڑ پڑتا ہے، بھاگ جاتا ہے، ناراض ہو جاتا ہے)

(ہ) چغل خور کی چغل خوری کا نتیجہ ___________ کی صورت میں نکلا۔ (طلاق، سر پُھٹوّل، قتل و غارت)

۶۔ اس لوک کہانی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل محاورات اور الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

تِلملانا، اَدھ مُوا، ہلکان ہونا، کانوں کان خبر نہ ہونا، شش و پنج میں مبتلا ہونا، دردر کی خاک چھاننا

جُملہ مُعترضہ:

جملہ معترضہ ایسا لفظ یا جملہ ہوتا ہے جو وضاحت یا طنز کے لیے لکھا یا بولا جاتا ہے۔ اس کے ہونے سے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا البتہ اس کے نہ ہونے سے بات میں یک گونہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ غبارِ خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ) کا تازہ ایڈیشن مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

۲۔ بلال (پروفیسر فاروق کا بیٹا) جماعت میں اوّل آیا ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ کسی کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا یا کسی سے غلط باتیں منسوب کرنا فتنہ پروری ہے۔اس کے نقصانات پر دس بارہ سطروں کا نوٹ لکھیے۔

۲۔ طلبہ اپنے استاد سے پوچھ کر کسی اور مصنف کی کوئی لوک کہانی پڑھیں۔

۳۔ بُری عادتیں کیسے ترک کی جائیں؟ اپنے استاد سے پوچھ کر کم از کم تین نکات لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو توجہ دلائی جائے کہ چغلی، غیبت، جھوٹ، گالی دینا اور دیگر اخلاقی عیوب بڑی بُرائیاں ہیں۔

۲۔ طلبہ سے ایسی سماجی برائیوں کی فہرست تیار کرائیں جو ہمارے ہاں عام ہیں، پھر طلبہ سے وعدہ لیا جائے کہ وہ ہمیشہ ان سے بچتے رہیں گے۔

۳۔ طلبہ کو لوک کہانی کے مفہوم اور اَخلاقی مقصد سے آگاہ کیا جائے۔

مولوی عبدالحق

(۱۸۷۲ء-۱۹۶۱ء)

مولوی عبدالحق ضلع میرٹھ یوپی کے ایک گاؤں ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فیروز پور میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کے شاگرد اور مولانا ظفر علی خاں کے ہم جماعت رہے۔ ۱۸۹۴ء میں بی اے کر کے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ چند سال تک مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرّس کے فرائض انجام دیے، پھر محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ بعد ازاں جامعہ عثمانیہ میں صدرِ شعبۂ اردو رہے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقیِ اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر اردو زبان و ادب کو ترقی دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۱ء تک انجمن ترقیِ اردو پاکستان کے صدر رہے۔ ان کی خدماتِ زبان و ادبِ اردو کے اعتراف میں الٰہ آباد یونی ورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

مولوی عبدالحق ایک بلند پایہ محقق و نقّاد، ماہر لغت نگار اور عمدہ انشا پرداز تھے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے پوری عمر جاں فشانی سے کام کیا۔ اردو کو پاکستان کی سرکاری، دفتری اور ذریعۂ تعلیم کی زبان بنانے کے لیے وہ عمر بھر کوشاں رہے۔ وہ اردو یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے مگر ان کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا تاہم کراچی میں اردو کالج ضرور قائم ہو گیا۔ فی الحقیقت وہ اردو کے بہت بڑے مُحسن ہیں۔ ان کی ناقابلِ فراموش خدمات کے پیشِ نظر انھیں ''بابائے اردو'' کا لقب ملا۔

ان کا ادبی اسلوب صاف، سادہ اور دل کش ہے۔ انھوں نے لغت تیار کیا لیکن اُن کا سب سے خوب صورت کام ان کے خاکے ہیں، جن میں ایسی خوبیاں ہیں کہ ہر پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے۔

ان کی تصانیف میں مرحوم دِلّی کالج، سر سیّد احمد خان: حالات و افکار، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، افکارِ حالی، مُقدّماتِ عبدالحق، خُطباتِ عبدالحق اور چند ہم عصر شامل ہیں۔

نام دیو مالی

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ پر واضح کرنا کہ محنت میں عظمت بھی ہے اور عزت بھی۔
۲۔ طلبہ کو بتانا کہ صرف تفویض شدہ کام کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا، ہر کام دل جمعی اور دل چسپی سے کیا جانا چاہیے۔
۳۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا۔
۴۔ مولوی عبدالحق کے اُسلوب سے آگاہ کرنا۔
۵۔ طلبہ کو باور کرانا کہ انسان کی عظمت کام سے ہے نہ کہ طبقاتی برتری سے۔

نام دیو، مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد[۱] (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں:

قیس ہو کوہ کن ہو یا حاؔلی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ مَیں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ مَیں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا، مثلاً: کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا۔ پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذّت آنے لگے، بے مزہ کام نہیں، بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دل چسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اُسے دیکھا کرتا، مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں

۱۔ مغلیہ دور کا ایک تاریخی مقبرہ جو کئی عمارتوں اور حصوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ایک حصّے میں مولوی عبدالحق نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔

ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا، جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کر دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُن سے چُپکے چُپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پُھولتے پھلتے، اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اِتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اُسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا، اُسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دُور دُور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اُسے علاج کے لیے بُلا لے جاتے۔ بلا تامّل چلا جاتا، مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ رَوَشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سِنچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا، بُہارنا، صبح شام روزانہ، غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے، جو بچ رہے، وہ ایسے نڈھال اور مُرجھائے ہوئے تھے جیسے دِق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کر لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وَقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور اُنھیں پینے کو پانی مشکل سے میسّر آتا تھا مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قِلّت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی

لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

مَیں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اُس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی تُرشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش گوار آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سیّد سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادُر) ناظمِ تعلیمات کو تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سُنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سر سبز و شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔ اُسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگرانِ کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ اُن کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اُس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا، البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے سچّا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے۔ یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا، نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یُورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلّڑ اُس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔

وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور مُنکسِر المزاج تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھُک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایا، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ مَیں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے، اسی لیے اُسے اپنے کام پر فخر یا غُرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بَیر تھا نہ جَلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے مَحبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا لیکن

اُسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو مَیں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قُدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحِیّت رکھی ہے، اس صلاحِیّت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے، نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کُندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ پوچھے گا کہ مَیں نے جو اِستعداد تجھ میں وَدیعت کی تھی، اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تُو نے کیا کِیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا؟ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔ تھا تو ذات کا ڈھیڑ، پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

(چند ہم عصر)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) نام دیو نے پانی کی قِلّت کے زمانے میں چمن کو کیسے شاداب رکھا؟

(ب) نام دیو مالی نے انعام لینے سے کیوں انکار کیا؟

(ج) لوگ بچوں کے علاج کے لیے نام دیو کے پاس کیوں آتے تھے؟

(د) نام دیو کی موت کا سبب کیا تھا؟

(ہ) مصنف کے خیال میں اچھا انسان کیسے بنا جا سکتا ہے؟

(و) نام دیو مالی کے اوصاف میں سب سے نمایاں وصف کیا ہے؟

۲۔ سبق کے متن کو مدِّنظر رکھ کر درست جواب پر (✓) نشان لگائیے:

(الف) سبق ''نام دیو مالی'' کس کتاب سے لیا گیا ہے؟

(i) چند ہم عصر　　(ii) مقدماتِ عبدالحق

(iii) خطباتِ عبدالحق　　(iv) بزمِ خوش نفساں

(ب) مقبرہ رابعہ دورانی کہاں واقع ہے؟

(i) دِلّی میں (ii) اورنگ آباد میں

(iii) حیدرآباد میں (iv) الٰہ آباد میں

(ج) باغ کے داروغہ کون تھے؟

(i) سید سراج الحسن (ii) مولوی عبدالحق

(iii) عبدالرحیم فینسی (iv) ایوب عباسی

(د) نام دیو بڑی تندہی سے اپنے کام میں مصروف اور مگن رہتا تھا، اس کی وجہ تھی:

(i) تنخواہ کا لالچ (ii) افسران کی خوشی

(iii) بے عزتی کا خوف (iv) اپنے کام سے محبت

(ہ) مصنف نے کس چیز کو بے کار کہا ہے؟

(i) جبری مشقت (ii) بے مزہ کام

(iii) محض حکم کی تعمیل (iv) ڈر کر کام کرنے کو

(و) مصنف نے انسان کی فطری کمزوری کی بنا پر اسے کہا ہے:

(i) کاہل اور نکما (ii) نکما اور کام چور

(iii) کاہل اور کام چور (iv) دلیر مگر سُست

(ز) گدلا پانی پودوں کے لیے تھا:

(i) ضرر رساں (ii) بے سود

(iii) مفید (iv) آبِ حیات

(ح) درجۂ کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے:

(i) جِدّ وجُہد (ii) صلاحیت

(iii) خوش بختی (iv) وسائل کا ہونا

(ط) ڈاکٹر سراج الحسن کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ تھے:

(i) نبّاض (ii) فیّاض

(iii) مردم شناس (iv) خوش مزاج

۳۔ سبق کے متن کو مدِنظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سچائی، نیکی اور حُسن کسی کی میراث نہیں۔ درست/ غلط

(ب) نام دیو پھولوں اور پھلوں کی شناخت رکھتا تھا۔ درست/ غلط

(ج) نام دیو مالی دو بچوں کا باپ تھا۔ درست/ غلط

(د) درجۂ کمال تک پہنچنے کی کوشش سے ہر کوئی درجۂ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ درست/ غلط

(ہ) نام دیو مالی مقبرہ رابعہ دورانی کے باغ میں چوکیدار تھا۔ درست/ غلط

(و) بے مزہ کام نہیں، بیگار ہے۔ درست/ غلط

(ز) نام دیو مالی بچّوں کے علاج میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ درست/ غلط

(ح) باغ کے داروغہ کو دوسروں سے کام لینا نہیں آتا تھا۔ درست/ غلط

(ط) نام دیو مالی شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے فوت ہو گیا۔ درست/ غلط

۴۔ سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۵۔ نام دیو مالی کی زندگی سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ مفصل لکھیں۔

۶۔ درجِ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے اور جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

ہار، قلم، کان، اردو، کف، لگن

۷۔ درجِ ذیل محاورات اور الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:

آفت ٹوٹ پڑنا، اوسان خطا ہونا، تفویض، محظوظ، مہا کاج، یُورش، بشاشت، بے دم ہونا، سیوا

ذُو معنی الفاظ:

ایسے الفاظ کا املا تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن ان کے دو معنی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض اوقات ایک معنی میں مذکر جب کہ دوسرے معنوں میں مؤنث ہوتا ہے۔ مثلاً تکرار بمعنی جھگڑا مؤنث ہے اور بمعنی اعادہ مذکر ہے۔ اسی طرح قلم (آلۂ تحریر) مذکر اور پودے کی قلم مؤنث ہے۔ کف بمعنی ہتھیلی مؤنث اور بمعنی جھاگ مذکر ہے۔

۸۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

مصنوعی، توانا، تندرست، توقیر، محبت، تریاق، رہبر

مبتدا اور خبر کے حوالے سے تقطیع کرنا:

بعض افعال ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں جب تک فاعل کے ساتھ کوئی اسم یا صفت نہ ملے، پورا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ ایسے افعال کے فاعل کو اسم (مبتدا) اور اس کے علاوہ جو اسم یا صفت ہو، وہ خبر کہلاتی ہے۔

درجِ ذیل کو غور سے دیکھیے:

بلال بہت ہوشیار ہے۔

ارسہ دیانت دار ہے۔

نام دیو مالی علاج کا ماہر تھا۔

وقار اپنے کام میں مگن تھا۔

ان جملوں میں ''ہے'' اور ''تھا'' افعالِ ناقص ہیں جب کہ بلال، ارسہ، نام دیو مالی اور وقار مبتدا اور ہوشیار، دیانت دار، ماہر اور مگن خبر ہیں۔

۹۔ نام دیو مالی کے اہم اوصاف ترتیب وار لکھیں۔

سرگرمیاں

۱۔ ایک عام مالی اور نام دیو مالی میں آپ جو فرق محسوس کرتے ہیں، وہ کاپی میں تحریر کریں۔

۲۔ نام دیو مالی جیسے کردار معاشرے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوں یا اپنے استاد سے پوچھ کر ایسے کردار کی خوبیاں جماعت کے کمرے میں دیگر طلبہ کو سنائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو خاکہ نگاری کی خوبیاں بتائی جائیں۔

۲۔ مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے دیگر خاکوں میں سے کم از کم دو خاکے طلبہ کو پڑھ کر سنائے جائیں۔

۳۔ مولوی عبدالحق کے سوانحی حالات خصوصاً اردو زبان و ادب کے لیے ان کی خدمات کی تفصیل طلبہ کو بتائی جائے۔

قدرت اللہ شہاب
(۱۹۱۷ء-۱۹۸۶ء)

قدرت اللہ شہاب گلگت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جموں میں پائی۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ ۱۹۴۱ء میں آئی سی ایس کے مقابلے میں کامیاب ہوکر اِنڈین سِول سروس میں شامل ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی دو برس حکومتِ آزاد کشمیر کے سیکرٹری جنرل رہے، اس کے بعد وزارتِ اطلاعات ونشریات حکومتِ پاکستان میں ڈپٹی سیکرٹری اور پھر جھنگ میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک گورنر جنرل غلام محمد، صدر سکندر مرزا اور صدر ایوب خاں کے سیکرٹری رہے۔ تین برس تک ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۶۶ء میں واپس آ کر مرکزی سیکرٹری تعلیم مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں وفات پائی اور اسلام آباد میں دفن ہوئے۔

وہ زبان و بیان پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کا اسلوب سادہ ہے، بایں ہمہ ان کی تحریروں میں بڑی جاذبیت اور دل کشی ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے لکھنے کا آغاز معروف شاعر اختر شیرانی کے رسالے رومان سے کیا تھا۔ ۳۱ رجنوری ۱۹۵۹ء کو رائٹرز گلڈ معرضِ وجود میں آیا تو وہ اس کے پہلے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ ان کی تصانیف میں یا خدا (۱۹۴۸ء)، نفسانے (۱۹۵۰ء)، ماں جی (۱۹۶۸ء) اور شہاب نامہ (۱۹۸۶ء) شامل ہیں۔ شہاب نامہ قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت ہے، جو ان کی تمام تصانیف سے بڑھ کر مقبول ہوئی۔ گذشتہ پچیس برس میں اس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

علی بخش

تدریسی مقاصد

۱۔ قدرت اللہ شہاب کی اس تحریر کے حوالے سے شہاب نامہ کا تعارف کرانا۔
۲۔ علامہ محمد اقبالؒ کی نجی زندگی کے بعض پہلوؤں سے واقفیت دلانا۔
۳۔ طلبہ کو ایک عمدہ ادبی تحریر کی خوبیوں سے آشنا کرنا۔
۴۔ طلبہ کو صنفِ ادب ''خودنوشت'' سے آگاہ کرنا اور ان پر اس کی خوبیاں واضح کرنا۔

ایک روز مَیں کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک جگہ خواجہ عبدالرحیم ① صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبالؒ کے دیرینہ اور وفادار ملازم علی بخش ② کو حکومت نے اس کی خدمات کے سلسلے میں لائل پور میں ایک مُربع زمین عطا کی ہے۔ وہ بچارا کئی چکر لگا چکا ہے لیکن اسے قبضہ نہیں ملتا، کیونکہ کچھ شریر لوگ اس پر ناجائز طور پر قابض ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: ''جھنگ، لائل پور کے بالکل قریب ہے، کیا تم علی بخش کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟''

مَیں نے فوراً جواب دیا: ''مَیں آج ہی اسے اپنی موٹر کار میں جھنگ لے جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح اس کو زمین کا قبضہ دلوا کے چھوڑوں گا۔''

خواجہ صاحب مجھے ''جاوید منزل'' ③ لے گئے اور علی بخش سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ تم فوراً تیار ہو کر ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت جلد تمھاری زمین کا قبضہ دلوا دیں گے۔''

علی بخش کسی قدر ہچکچایا اور بولا: ''سوچیے تو سہی، مَیں زمین کا قبضہ لینے کے لیے کب تک مارا مارا پھروں گا؟ قبضہ نہیں ملتا تو کھائے کڑھی، لاہور سے جاتا ہوں تو جاوید کا نقصان ہوتا ہے۔ جاوید بھی کیا کہے گا کہ بابا کن جھگڑوں میں پڑ گیا؟''

لیکن خواجہ صاحب کے اصرار پر وہ میرے ساتھ ایک آدھ روز کے لیے جھنگ چلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہے تو غالباً اس کے دل میں سب سے بڑا وہم یہ ہے کہ شاید اب مَیں بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح علّامہ اقبالؒ کی باتیں پوچھ پوچھ کر اس کا سر کھپاؤں گا لیکن مَیں نے بھی عزم کر رکھا ہے کہ مَیں خود علی بخش سے حضرت علامہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اگر واقعی وہ علی بخش کی زندگی کا ایک جزو ہیں، تو یہ جوہر خود بخود عشق اور مُشک کی طرح ظاہر

۱۔ خواجہ عبدالرحیم لاہور کے معروف بیرسٹر تھے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔
۲۔ علی بخش تقریباً چالیس سال، علامہ اقبالؒ کے نہایت وفادار خدمت گزار رہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اُن کی بیوی فوت ہوگئی، تو انھوں نے پھر شادی نہیں کی۔
۳۔ جاوید منزل، لاہور میں علامہ اقبالؒ روڈ پر واقع ہے۔ یہ علامہ اقبالؒ کی قیام گاہ تھی، جسے اب ''اقبالؒ میوزیم'' بنا دیا گیا ہے اور یہ محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں ہے۔

ہو کر رہے گا۔

میری توقع پوری ہوتی ہے اور تھوڑی سی پریشان کُن خاموشی کے بعد علی بخش مجھے یوں گُھورنے لگتا ہے کہ یہ عجیب شخص ہے، جو ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات نہیں کرتا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور ایک سینما کے سامنے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر وہ بڑبڑانے لگا: ''مسجدوں کے سامنے تو کبھی ایسا رش نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے۔''

ایک جگہ مَیں پان خریدنے کے لیے رُکتا ہوں، تو علی بخش بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے: ''ڈاکٹر صاحب کو پان پسند نہیں تھے۔''

پھر شاید میری دل جوئی کے لیے وہ مسکرا کر کہتا ہے: ''ہاں حقّہ خوب پیتے تھے۔ اپنا اپنا شوق ہے۔ پان کا ہو یا حقّے کا!''

شیخوپورہ سے گزرتے ہوئے علی بخش کو یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک بار یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں پر ایک مسلمان تحصیل دار تھے، جو ڈاکٹر صاحب کے پکّے مرید تھے، انھوں نے دعوت دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو پلاؤ اور سیخ کباب بہت پسند تھے۔ آموں کا بھی بڑا شوق تھا۔ وفات سے کوئی چھے برس پہلے، جب ان کا گلا پہلی بار بیٹھا، تو کھانا پینا بہت کم ہو گیا۔

اب علی بخش کا ذہن بڑی تیزی سے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے اور وہ بڑی سادگی سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سناتا جاتا ہے۔ ان باتوں میں قصوں اور کہانیوں کا رنگ نہیں، بلکہ ایک نشے کی سی کیفیت ہے۔ جب تک علی بخش کا یہ نشہ پورا نہیں ہوتا، غالبًا اسے ذہنی اور روحانی تسکین نہیں ملتی۔ ''صاحب! جب ڈاکٹر صاحب نے دَم دیا ہے، مَیں ان کے بالکل قریب تھا۔ صبح سویرے مَیں نے انھیں فروٹ سالٹ پلایا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی، لیکن عین پانچ بج کر دس منٹ پر ان کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی نیلی سی چمک آئی اور زبان سے اللہ ہی اللہ نکلا۔ مَیں نے جلدی سے ان کا سر اُٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انھیں جھنجوڑنے لگا لیکن وہ رخصت ہو گئے تھے۔''

کچھ عرصہ خاموشی طاری رہتی ہے۔

پھر علی بخش کا موڈ بدلنے کے لیے مَیں بھی اس سے ایک سوال کر ہی بیٹھتا ہوں: ''حاجی صاحب! کیا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ شعر یاد ہیں؟''

علی بخش ہنس کر ٹالتا ہے: ''مَیں تو اَن پڑھ جاہل ہوں۔ مجھے ان باتوں کی بھلا کیا عقل!''

''مَیں نہیں مانتا۔'' مَیں نے اِصرار کیا: ''آپ کو ضرور کچھ یاد ہو گا۔''

''کبھی اے حقیقتِ منتظر والا کچھ کچھ یاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو خود بھی بہت گنگنایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب عام طور پر مجھے اپنے کمرے کے بالکل نزدیک سُلایا کرتے تھے۔ رات کو دو ڈھائی بجے دبے پاؤں اُٹھتے تھے اور وضو کر کے جانماز پر جا بیٹھتے تھے۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک سجدے میں پڑے رہتے تھے۔ فارغ ہو کر بستر پر آ لیٹتے تھے۔ مَیں حقہ تازہ کر کے لا رکھتا تھا۔ کبھی ایک، کبھی دو کش لگاتے تھے۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی۔ بس صبح تک اسی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے۔''

میرا ڈرائیور احترامًا علی بخش کو سگریٹ پیش کرتا ہے لیکن وہ غالبًا حجاب میں آ کر اسے قبول نہیں کرتا۔

''ڈاکٹر صاحب میں ایک عجیب بات تھی۔ کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے انھیں ایک جھٹکا سا لگتا تھا اور وہ مجھے آواز دیتے تھے۔ انھوں نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسے موقعے پر مَیں فوراً ان کی گردن کی پچھلی رگوں اور پٹھوں کو زور زور سے دبایا کروں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کہتے تھے: بس! اور مَیں دبانا چھوڑ دیتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مجھے اپنے نزدیک سُلایا کرتے تھے۔''

ہر چند میرا دل چاہتا ہے کہ مَیں علی بخش سے اس واردات کے متعلق کچھ مزید استفسار کروں لیکن مَیں اس کے ذہنی ربط کو توڑنے سے ڈرتا ہوں۔

''ڈاکٹر صاحب بڑے درویش آدمی تھے۔ گھر کے خرچ کا حساب کتاب میرے پاس رہتا تھا۔ مَیں بھی بڑی کفایت سے کام لیتا تھا۔ ان کا پیسا ضائع کرنے سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ریل کے سفر کے دوران میں کئی کئی سٹیشن بھوکا رہتا تھا، کیونکہ وہاں روٹی مہنگی ملتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے: علی بخش انسان کو ہمیشہ وقت کی ضرورت کے مطابق چلنا چاہیے۔ خواہ مخواہ ایسے ہی بھوکے نہ رہا کرو۔ اب اسی مربعے کے ٹنٹے کو دیکھ لیجیے۔ لائل پور کے ڈپٹی کمشنر صاحب، مال افسر صاحب اور سارا عملہ میری بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ بڑے اَخلاق سے مجھے اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ ایک روز بازار میں ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور مجھے گلے لگا کر دیر تک روتا رہا۔ یہ ساری عزت ڈاکٹر صاحب کی برکت سے ہے۔ مربعے کی بھاگ دوڑ میں میرے سر کچھ قرضہ بھی چڑھ گیا ہے لیکن مَیں اس کام کے لیے بار بار لاہور کیسے چھوڑوں؟ جاوید کا نقصان ہوتا ہے۔''

''سنا ہے، اپریل میں جاوید چند مہینوں کے لیے ولایت سے لاہور آئے گا۔ جب وہ چھوٹا سا تھا، ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اللہ کے کرم سے اب بڑا ہوشیار ہو گیا ہے۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اور منیرہ بی بی[1] بہت کم عمر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نرس کے لیے اشتہار دیا۔ بے شمار جواب آئے۔ ایک بی بی نے تو یہ لکھ دیا کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی قدر پریشان ہوئے اور کہنے لگے: علی بخش! دیکھو تو سہی، اس خاتون نے کیا لکھا ہے؟ مَیں بڈھا آدمی ہوں، اب شادی کیا کروں گا؟ لیکن پھر علی گڑھ سے ایک جرمن لیڈی[2] آ گئی۔''

علی بخش کا تخیل بڑی تیز رفتاری سے ماضی کے دُھندلکوں میں پرواز کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے اپنے ڈاکٹر صاحب یا جاوید یا منیرہ بی بی کی کوئی نہ کوئی خوش گوار یاد آتی رہتی ہے۔

جھنگ پہنچ کر مَیں اسے ایک رات اپنے ہاں رکھتا ہوں۔ دوسری صبح اپنے ایک نہایت قابل اور فرض شناس مجسٹریٹ کپتان مہابت خان کے سپرد کر دیتا ہوں۔

۱۔ علامہ اقبالؒ کی بیٹی منیرہ، جسے علامہ پیار سے ''بانو'' کہا کرتے تھے۔ منیرہ، میاں صلاح الدین سے بیاہی گئیں جو لاہور کی معروف شخصیت میاں امیر الدین کے بیٹے تھے۔

۲۔ مراد ہے: ڈورس احمد، جو حیاتِ اقبالؒ کے آخری دو برسوں میں، علامہ کے بچّوں کی اتالیق اور نگران کے طور پر جاوید منزل میں مقیم رہیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی سالی تھیں۔

کپتان مہابت خان، علی بخش کو ایک نہایت مقدس تابُوت کی طرح عقیدت سے چھُو کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ وہ علی بخش کو آج ہی اپنے ساتھ لائل پور لے جائے گا اور اس کی زمین کا قبضہ دلا کر ہی واپس لوٹے گا: ''حد ہوگئی! اگر ہم یہ معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتے تو ہم پر لعنت ہے۔''

(شہاب نامہ)

☆☆☆☆

مشق

ا۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) علی بخش سے مصنف کی کیسے ملاقات ہوئی؟

(ب) علی بخش کو ایک مربّع زمین کہاں اور کیوں الاٹ ہوئی؟

(ج) مصنف کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے علی بخش کے دل میں کیا وہم تھا؟

(د) ایک سینما کے سامنے بھیڑ دیکھ کر علی بخش نے کیا کہا؟

(ہ) شیخو پورہ سے گزرتے ہوئے علی بخش کو کیا یاد آیا؟

۲۔ سبق کا خلاصہ اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

۳۔ علی بخش کے کردار کی نمایاں خوبیاں پیرا گراف کی شکل میں لکھیں۔

۴۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کا حال علی بخش کی زبانی بیان کیجیے۔

۵۔ متن کی روشنی میں قوسین میں دیے گئے الفاظ کی مدد سے مندرجہ ذیل جملے مکمل کیجیے:

(الف) قبضہ نہیں ملتا تو کھائے .... ۔ (خصم کو، کڑھی، کھیر، دھوپ)

(ب) علی بخش کے مطابق اقبالؒ اکثر .... گنگناتے تھے۔ (مسلماں کے لہو میں ۔ خودی کو کر بلند اتنا۔ کبھی اے حقیقتِ مُنتظر ۔ تُو رہ نوردِ شوق ہے)

(ج) ڈاکٹر صاحب بڑے .... آدمی تھے۔ (عالم، درویش، سیاسی، دانش ور)

(د) پھر علی گڑھ سے ایک .... لیڈی آگئی۔ (فرنچ، انڈین، انگلش، جرمن)

(ہ) کپتان مہابت خاں، علی بخش کو ایک نہایت مقدس .... کی طرح عقیدت سے چھو کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ (تابوت، کتاب، چیز، امانت)

۶۔ سبق ''علی بخش'' کے متن کو مدِنظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق ''علی بخش'' کس کتاب سے لیا گیا ہے؟

(i) شہاب نامہ (ii) نفسانے (iii) ماں جی (iv) یا خدا

(ب) مصنف کام کے سلسلے میں کہاں گئے تھے؟

(i) لاہور (ii) لائل پور (iii) شیخوپورہ (iv) جھنگ

(ج) علی بخش کو زمین کہاں دی گئی تھی؟

(i) جھنگ (ii) لائل پور (iii) لاہور (iv) خانیوال

(د) آخری عمر میں علامہ محمد اقبالؒ کا کھانا پینا کم ہو گیا تھا۔

(i) بڑھاپے کی وجہ سے (ii) دمے کی وجہ سے (iii) گلے کی خرابی کی وجہ سے (iv) معدے کی خرابی کی وجہ سے

(ہ) علی بخش کے مطابق ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی پسندیدہ خوراک کیا تھی؟

(i) پلاؤ (ii) سیخ کباب (iii) پلاؤ اور سیخ کباب (iv) چپلی کباب اور زردہ

(و) حکومت نے علی بخش کو کتنی زمین الاٹ کی؟

(i) آدھا مربع (ii) ایک مربع (iii) دو مربعے (iv) تین مربعے

(ز) علامہ محمد اقبالؒ کون سا پھل پسند کرتے تھے؟

(i) انگور (ii) لوکاٹ (iii) آم (iv) خوبانی

(ح) ڈاکٹر محمد اقبالؒ رات کتنے بجے جانماز پر جا بیٹھتے؟

(i) ایک بجے (ii) دو بجے (iii) اڑھائی بجے (iv) دو اڑھائی بجے

(ط) ڈاکٹر محمد اقبالؒ کو سوتے ہوئے جھٹکا لگتا تو کیا کرتے تھے؟

(i) دوائی لے لیتے (ii) علی بخش سے گردن کے پٹھے دبواتے

(iii) سو جاتے (iv) بے چین ہو کر ٹہلنے لگتے

۷۔ سبق کے متن کو مدِنظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) علی بخش سے مصنف کی ملاقات خواجہ عبدالرحیم نے کرائی۔ درست/ غلط

(ب) شیخوپورہ کے وکیل علامہ محمد اقبالؒ کے مرید تھے۔ درست/ غلط

(ج) ڈاکٹر محمد اقبالؒ گھر کے اخراجات کا حساب کتاب نہیں رکھتے تھے۔ درست/ غلط

(د) ڈاکٹر صاحب کے ہاں اعظم گڑھ سے جرمن لیڈی آئیں۔ درست/ غلط

(ہ) فروٹ سالٹ سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بحال ہو گئی۔ درست/ غلط

(و) مہابت خان نے اعلان کیا کہ وہ علی بخش کا کام کرا کے دم لے گا۔ درست/ غلط

۸۔ سبق ''علی بخش'' کے متن کے مطابق کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کا رابطہ کالم (ب) کے الفاظ سے کریں:

کالم (الف)	کالم (ب)
خواجہ عبدالرحیم	حقہ
جاوید اقبال	مرید
پان	جاوید منزل
تحصیل دار	جانماز
مہابت خان	منیرہ
اڑھائی بجے	قبضہ

۹۔ حوالۂ متن اور سیاق وسباق کے ساتھ درج ذیل پیراگراف کی تشریح کیجیے:

''اب علی بخش کا ذہن..........................لیکن وہ رخصت ہو گئے تھے۔''

۱۰۔ درجِ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیے:

شریر، آمادہ، بھیڑ، سادگی، فارغ، مُقدس، خوش گوار

سرگرمیاں

۱۔ علی بخش نے علامہ محمد اقبالؒ کی نظم ''کبھی اے حقیقتِ مُنتَظَر .....'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ نظم خوش الحانی سے پڑھ کر جماعت کے کمرے میں سنائی جائے۔

۲۔ اقبالؒ کی کوئی اور نظم چارٹ پر خوش خط لکھ کر جماعت کے کمرے میں آویزاں کریں۔

۳۔ مصنف کی کوئی اور تحریر جماعت کے کمرے میں پڑھ کر سنائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ قدرت اللہ شہاب کا تفصیلی اور بھرپور تعارف کرایا جائے۔

۲۔ شہاب نامہ سے چند اقتباسات پڑھ کر طلبہ کو سنائے جائیں۔

۳۔ چالیس برس تک علامہ محمد اقبالؒ کی خدمت کرنے والے وفادار ملازم، علی بخش کے شخصی اوصاف کو نمایاں کیا جائے۔

۴۔ طلبہ کو علامہ محمد اقبالؒ کی ذات وصفات اور شاعری کے حوالے سے کچھ باتیں بتائی جائیں۔

حکیم محمد سعید
(۱۹۲۰ء-۱۹۹۸ء)

نامور طبیب، ادیب اور سماجی و سیاسی شخصیّت حکیم محمد سعید دہلی میں حکیم عبدالمجید کے گھر پیدا ہوئے۔ انھوں نے پانچ برس کی عمر میں ناظرہ قرآنِ پاک پڑھ لیا۔ سات برس کی عمر میں والدہ کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کی اور نو برس کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کر لیا۔ بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ عربی، فارسی اور انگریزی سیکھی۔ ۱۹۳۹ء میں طبیہ کالج دہلی سے طب کی تعلیم مکمل کی۔ عملی زندگی کا آغاز ہمدرد دواخانے میں اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کے ساتھ شمولیت سے کیا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک دونوں بھائیوں نے ہمدرد کو ایشیا کا سب سے بڑا دواساز ادارہ بنا دیا۔ حکیم محمد سعید ۹۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

پاکستان میں وہ ہمدرد لیبارٹریز (وقف) کے بانی اور مُنتظِم ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان طبّی ایسوسی ایشن اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ ۱۹۹۳ء-۱۹۹۴ء میں وہ صدرِ پاکستان کے طبّی مشیر اور گورنر سندھ کے عُہدوں پر بھی فائز رہے۔ حکیم محمد سعید ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو کراچی میں شہید کر دیے گئے۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا کہ یہ صرف ایک شخص کا نہیں، ایک طرح سے پاکستان کی شناخت کا قتل ہے۔

حکیم محمد سعید کی تحریروں میں خاصا تنوّع ہے۔ دینی، اخلاقی، طبّی اور صحتِ عامہ سے متعلق انھوں نے بہ کثرت مضامین لکھے۔ بچوں اور نوجوانوں کے لیے بھی ان کی بڑی دل چسپ تحریریں ملتی ہیں۔ انھیں دنیا کے مختلف ممالک میں بار بار جانے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا، چناں چہ اپنی سیّاحت کا حال انھوں نے مختلف سفرناموں میں قلم بند کیا۔

ان کی چند تصانیف یہ ہیں: اخلاقیاتِ نبوی صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم، قرآن روشنی ہے، ذیابیطس نامہ، سائنس اور معاشرہ، قلب اور صحت، تعلیم و صحت، ارضِ قرآنِ حکیم، یورپ نامہ، جرمن نامہ، کوریا کہانی، سفرِ دمشق، ایک مسافر چار مُلک، جاپان کہانی، داستانِ امریکہ، داستانِ حج، داستانِ لندن، درونِ روس، سعید سیّاح اردن میں، سعید سیّاح تہران میں اور سعید سیّاح ترکی میں۔

اِستنبول

تدریسی مقاصد

۱۔ برادر اسلامی ملک تُرکی کے بارے میں طلبہ کی معلومات میں اضافہ کرنا۔
۲۔ ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع تُرکی کے شہر استنبول کی عالمی اور تاریخی اہمیت اجاگر کرنا۔
۳۔ طلبہ کو حکیم محمد سعید کے طرزِ تحریر سے آگاہ کرنا۔
۴۔ طلبہ کو جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی معلومات تحریر کرنے کے فن سے آشنا کرانا۔
۵۔ طلبہ کو سفرنامے کی خوبیوں سے واقفیت دلانا۔

اِستنبول ترکی کا ایک شہر ہے۔ استنبول کے شہر پر مسلمانوں کا پہلا حملہ ۶۷۲ء میں ہوا تھا، لیکن وہ سات سال تک محاصرے کے بعد ناکام واپس ہوئے۔ اس محاصرے کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس میں جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ① شریک تھے۔ اسی مہم کے دوران میں ان کا انتقال ہوا اور وہ استنبول ہی میں مدفون ہوئے۔

اِستنبول (قُسطُنطُنیہ) کی فتح، مُرادثانی ② کے بیٹے محمد ثانی کے لیے، جسے محمد فاتح ③ بھی کہا جاتا ہے، مُقدّر ہو چکی تھی۔ سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۲ء میں شہر استنبول پر پوری منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کیا۔ ۲۹۔ مئی ۱۴۵۳ء کو اِستنبول پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ سلطان فاتحانہ انداز سے شہر میں داخل ہوا اور سب سے پہلے اس نے ایاصوفیہ میں جمعے کی نماز پڑھی۔

جب مسلمانوں نے قُسطُنطُنیہ کو فتح کیا تو یہاں کے لوگ دُور نکل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب فاتحین یہاں پہنچیں گے تو آسمان سے ایک فرشتہ اتر کر اُن کو واپس دھکیل دے گا۔ سلطان محمد فاتح گھوڑے سے اتر کر کلیسا کے اندر داخل ہوا اور اس نے وہیں نماز ادا کی۔

مسلمانوں نے اس میں بہت سی تعمیرات کا اضافہ کیا۔ دیواروں اور چھتوں کی پچی کاری پر سُرمئی قلعی کروا دی گئی۔ جن دیواروں پر بُت بنے ہوئے تھے، انھیں مُنہدم کروا کے نئی دیوار بنوا دی گئی۔ سلطان محمد نے ایک بلند مینار تعمیر کروایا۔ سلیم ثانی ④ نے شمال کی جانب دوسرا مینار بنوایا، مراد ثالث ⑤ نے باقی دو مینار اور مرمّت کا سارا کام مکمل کروایا۔ اس نے صدر دروازے کے پاس اندر کی طرف سنگِ جراحت کی دو بڑی بڑی نالیاں بنوائیں اور وہ دو بڑے چبوترے تعمیر کرائے، جن پر بیٹھ کر قرآنِ پاک کی تلاوت کی جاتی تھی۔

ایاصوفیہ کے برابر قبرستان ہی میں اکثر عثمانی حکمرانوں کے مزار واقع ہیں۔ سلطان مراد رابع ⑥ نے مسجد کی خالی دیواروں پر مشہور خطّاط مصطفیٰ چلبی سے بڑے بڑے سنہرے حروف میں آیاتِ قرآنی لکھوائیں۔ محمود اوّل ⑦ نے ۱۷۵۴ء میں

۱۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اولین میزبان بننے کا اعزاز اور شرف حاصل ہوا۔
۲۔ مراد ثانی عثمانیہ سلطنت کا ایک جلیل القدر بادشاہ تھا۔
۳۔ سلطان محمد فاتح (اصل نام محمد ثانی) کو یہ اعزاز وافتخار حاصل ہے کہ مسلمانوں کی صدیوں کی کوششوں کے بعد اس کے ہاتھوں قُسطُنطُنیہ فتح ہوا۔
۴ تا ۷۔ یہ سب عثمانیہ سلطنت کے اولوالعزم فرماں روا تھے جنھوں نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں ترکی کو مستحکم اور خوش حال بنانے کی مقدور بھر کوشش کی۔

وسیع چھت کا سلطانی راستہ، ایک خوب صورت فـــــوّارہ ، ایک مدرسہ اور شمال میں ایک وسیع دارُ الطّعام بنوایا، نیز مسجد میں ایک بیش قیمت کتب خانہ قائم کیا۔

سُلطان عبدالمجید کے عہد میں مسجد کے جن حصوں کے مُنہدم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ان کی مرمّت کروائی گئی۔ مشہور خطّاط مصطفیٰ عزّت آفندی کی لکھی ہوئی آٹھ گول لوحیں بھی اسی عہد میں نصب کی گئیں۔

اِستنبول یا قُسْطُنْطُنِیہ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے مساجد کا شہر کہا جاتا ہے، جہاں عثمانی عہد کا طرزِ تعمیر اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یوں تو پورے شہر میں تقریباً پانچ سو مساجد ہیں لیکن اسلامی فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ سلیمانیہ مسجد ہے۔

دو تین سال پہلے مَیں ترکی حکومت کی دعوت پر آیا تھا۔ کویت میں قائم مرکزِ طبِّ اسلامی کے زیرِ اہتمام اِستنبول میں تیسری طبِّ اسلامی کانفرنس ہوئی تھی۔ ترکی کے میرے ایک دوست ڈاکٹر پروفیسر ڈوگوا باچی ہیں۔ وہ ترکی کی تمام یونی ورسٹیوں کے سربراہ ہیں۔ اِستنبول کانفرنس کا انھوں نے شان دار انتظام کیا تھا۔ ترکی کے وزیرِ اعظم جناب تُرگت اَوزال ہمارے میزبان تھے۔ ہم سب مندُوبین ان کے ساتھ سلیمانیہ میں نمازِ جمعہ ادا کرنے آئے تھے۔ تمام مندوبین کے لیے اوّل صف میں انتظام تھا۔ ہزار ہا نمازی تھے۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ خطبۂ جمعہ آدھا عربی اور آدھا ترکی زبان میں تھا۔ جب نمازِ جمعہ ختم ہوئی تو اعلان کیا گیا کہ ''مندُوبین کے لیے راستہ دے دیں۔''

ذرا سا یہ اعلان ہوتے ہی منبر سے دروازے تک چار فیٹ کا راستہ بن گیا۔ نمازی دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ ایک انسان اپنی جگہ سے نہ ہلا اور ہم سب مندُوبین نہایت اطمینان سے باہر آ گئے۔ یہ تنظیم کی بات ہے۔ تُرک اب دنیا کی ایک نہایت شائستہ اور منظّم قوم بن چکے ہیں۔ ان کا یہ ڈِسپلن ان کو دنیا کی بڑی قوم بنا رہا ہے۔

اس مسجد کی تعمیر سلطان سلیمان کے ایما پر فنِ تعمیر کے مشہور ماہر معمار جناب محترم سنان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کا سنگِ بنیاد ۱۵۵۰ء میں رکھا گیا اور ۱۵۵۷ء میں اس کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد ترکی کی تمام مساجد سے مُمتاز ہے۔ اس مسجد کا گنبد بہت ہی دل نواز ہے، اس گنبد کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے پانچ اور گنبد ہیں، جو بالکل اس طرح محسوس ہوتے ہیں، جیسے تاروں کے درمیان چاند۔ اس مسجد کی کھڑکیوں پر بے انتہا نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ یہ مسجد ترکوں کے فنِ تعمیر اور ان کی نفاست پسندی کا حَسین مُرقّع ہے۔

سلیمانیہ سے مُلحق ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ یہاں مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اندازے کے مطابق ایک لاکھ قلمی کتابیں یہاں ہیں اور نہایت ترتیب و تنظیم سے رکھی ہوئی ہیں۔ جب مَیں اپنے رفیقوں کو باسفورس، گولڈن ہارن اور ایا صوفیہ

کی سیر کراتا ہوا یہاں سے سلیمانیہ میں لایا تو سب کی حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم سب نے یہاں اچھا خاصا وقت صرف کیا۔ اب یہاں سے ہم توپ کاپی سرائے چلے کہ ترکی میں یہ ایک نہایت اہم عجائب گھر ہے۔

ہم سب دوست، یعنی محترمہ خانم ڈسلوا، محترم ڈاکٹر محمد شعیب اختر، محترم ڈاکٹر عطاء الرحمان، محترم جناب ڈاکٹر ظفر اقبال توپ کاپی پہنچ گئے۔ یہاں آئے تو سیلانیوں (ٹورسٹوں) کا جمِ غفیر تھا۔ میرے دوستوں کو ناشتے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ توپ کاپی میں نہایت زوردار ناشتا کیا۔ مَیں نے بس جوس نوشِ جان کر لیا۔ ان دوستوں نے ترکش بند کی خوب تعریف کی۔ خیر جناب! جلدی، جلدی ناشتا کر کے ہم توپ کاپی سرائے میوزیم دیکھنے کو چل پڑے۔

اِستنبول کے عجائب خانوں میں توپ کاپی کی حیثیت شُہرہ آفاق ہے۔ یہاں رومی، بزنطینی اور عثمانی عہد کی ہزاروں لاکھوں قیمتی اشیا رکھی گئی ہیں، اس میں عثمانی سلاطین کے آثار، جواہرات، ملبُوسات اور دیگر اشیائے آرائش و تزئین کے علاوہ چینی، جاپانی، عربی اور یورپی عجائب بھی رکھے گئے ہیں۔

توپ کاپی میں آثارِ قدیمہ کے ایک عجائب گھر کے علاوہ فوجی عجائب خانہ بھی علیحدہ موجود ہے، جو ''اوقاف'' کہلاتا ہے۔ اسلامی ترکی آرٹ، ادب اور نقاشی نیز مصوّری کے بھی حیرت انگیز نمونے موجود ہیں۔ اسلامی علوم وفنون اور ثقافت کو آگے بڑھانے میں سلاجقہ ترک، بالخصوص عُثمانی حکمرانوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ انھی کے علمی ذوق کی وجہ سے اِستنبول کا عجائب خانہ توپ کاپی، جہاں نوادِر اور آثارِ قدیمہ کا مشہورِ عالم مرکز بنا، وہاں علم وفن کے بیش بہا ذخیروں اور نادر کتابوں کا بھی مخزن بنا۔ نوادرِ کتب اور اہم مخطوطات کے الگ شعبے ہیں۔ بعض ایسی کتابیں بھی وہاں موجود ہیں کہ جن کا ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے اور وہ نسخہ توپ کاپی میں ہے۔

انگریزوں کے علمی ذوق کی مدح وستائش بہت کی جاتی ہے، مگر خود ولیم راجرز نے اپنی مشہور تصنیف توپ کاپی میں یہ گلہ کیا ہے کہ انگریزوں نے بہت سے مسلم اداروں اور خاص طور پر بیتُ الحکمَت کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن توپ کاپی کو نظر انداز کر دیا، جہاں قدیم اسلامی عہد کی نادر و نایاب کتابیں بہ کثرت موجود ہیں اور مخطُوطات و مسوّدات کے لحاظ سے بھی دنیا کے عجائب خانے اور بہت سے میوزیم اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ تقریباً ہر علم وفن سے متعلق اہم کتابیں یہاں موجود ہیں۔

فنِ خطّاطی کے مظہر کی حیثیت سے قرآنِ کریم کی وہ آیات توپ کاپی میں موجود ہیں، جو مشہور خطّاطوں کی ہُنر مندی کے نمونے کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت وسوانحِ پر نُسخ میں ایک اہم مخطُوطہ بھی توپ کاپی میں موجود ہے۔

اِستنبول آ کر مسجد سلطان احمد کیسے نہ دیکھتے! ہمیں تو نمازِ ظہر بھی ادا کرنی تھی۔ یہاں سے ہم مسجد سلطان احمد آ گئے۔

سلطان احمد، سلطان محمد ثالث کا بڑا لڑکا تھا، چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ نو عمری کے باوجود ایک پُختہ کار اور صاحبِ تدبّر بادشاہ تھا۔ سلطان احمد نے ۲۸ سال کی عمر میں ۲۲۔ نومبر ۱۶۱۷ء کو وفات پائی۔

یہ اس کی بنوائی ہوئی شان دار مسجد ہے، جو شاہی مساجد میں بہت ممتاز ہے اور قدیم زمانے میں وہی جامع مسجد تھی۔ آج جامع سلطان احمد اپنے چھے میناروں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسے سلطان احمد نے اپنی وفات کے سال مکمل کیا۔ یہ شاہی مسجد، بہت سے مذہبی تہواروں کے منانے کی جگہ اور بہت سے درباری رسمی جلوسوں کا مرکز رہ چکی ہے۔ مسجد تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ یہاں سب نے وضو کیا۔ نمازِ ظہر اور نمازِ عصر ملا کر پڑھی۔ سیلانیوں کا یہاں بھی مجمع تھا اور خوب تھا۔ اب ہم اِستنبول کی سیر کے آخری مرحلے میں آ گئے تھے۔

مَیں ترکی جب بھی آتا ہوں، حضرت ابوایوّب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر ضرور آتا ہوں۔ آج بھی ہم پانچوں سوار آخر میں مزارِ اَقدس پر حاضر ہوئے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کا مرتبۂ علم ایسا تھا کہ صحابۂ کرامؓ مسائل کی تحقیق میں ان ہی سے رُجُوع کرتے تھے۔ حضرت ابوایوّب انصاریؓ کی شخصیت میں تین چیزیں نمایاں تھیں: جوشِ ایمانی، حق گوئی اور آنحضرت رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے بے کراں محبت وعقیدت۔ حضرت ابوایوّب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کا ایک مرتبہ ومقام یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کے میزبان رہے ہیں۔ جب آپ صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ منوّرہ میں داخل ہوئے تو ہر شخص چاہتا تھا کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قیام اس کے یہاں ہو، لیکن کارکنانِ قضاوقدر نے اس شَرف کے لیے جس گھر کو دیکھا، وہ حضرت ابوایوّب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کا کاشانہ تھا۔

نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارت کی روشنی میں فتحِ قُسطُنطُنیہ کے لیے حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں، جیسا کہ ابتدا میں ہم ذکر کر چکے ہیں، قُسطُنطُنیہ پر فوج کشی ہوئی تو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ اس گروہ میں شریک تھے۔ سفرِ جہاد میں ایک وبا پھیل گئی۔ مجاہدین کی بڑی تعداد اس وبا کا شکار ہوئی۔ حضرت ابوایوّب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ بھی علیل ہوئے۔ ان کا انتقال ہوا تو مسلمان مجاہدین نے انھیں رات کے وقت قُسطُنطُنیہ (استنبول) کی دیواروں کے نیچے دفن کر دیا۔ آج یہی مقبرہ دنیا کے مسلمانوں کے لیے مَرجعِ خیر و برکت بنا ہوا ہے۔ اب ہمیں اتا ترک ہوائی میدان جانا تھا۔ اپنا سامان لینا تھا۔ اَدَنا[1] جانے والے جہاز میں بیٹھنا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ مَیں نے اپنے ان دوستوں کو آج آٹھ گھنٹے میں اِستنبول کی سیر کرادی۔

(سعید سیّاح ترکی میں)

☆☆☆☆

۱۔ یہ ترکی کا نسبتاً ایک چھوٹا مگر تاریخی شہر ہے۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) اِستنبول پر مسلمانوں کے پہلے حملے کی خاص بات کیا ہے؟

(ب) ایا صوفیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

(ج) ترکی میں جمعۃُ المبارک کا آدھا آدھا خطبہ کن دو زبانوں میں دیا گیا؟

(د) ''توپ کاپی'' میوزیم کا تعارف اپنے الفاظ میں کرائیے۔

(ہ) مصنف کے شریکِ سفر دوستوں کے نام تحریر کیجیے۔

۲۔ حوالۂ متن اور سیاق وسباق کے ساتھ درج ذیل پیرا گراف کی تشریح کیجیے:

''توپ کاپی میں آثارِ قدیمہ کے.....................جن کا ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے۔''

۳۔ سبق ''اِستنبول'' کا متن مدِّنظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سبق ''اِستنبول'' کس کی تحریر ہے؟

(i) اختر ریاض الدین	(ii) حکیم محمد سعید
(iii) قدرت اللہ شہاب	(iv) شفیع عقیل

(ب) مسجد سلیمانیہ کس نے تعمیر کرائی؟

(i) سلطان مراد	(ii) سنان
(iii) سلیم ثانی	(iv) سلطان عبدالحمید

(ج) ایا صوفیہ کے برابر کیا ہے؟

(i) عجائب گھر	(ii) کتاب خانہ
(iii) قبرستان	(iv) فوجی عجائب خانہ (اوقاف)

(د) مسلمانوں نے استنبول پر پہلا حملہ کب کیا؟

(i) ۶۷۲ء	(ii) ۶۷۱ء
(iii) ۶۷۳ء	(iv) ۶۷۷ء

(ہ) مسلمانوں نے اِستنبول کا محاصرہ کتنے سال بعد اُٹھایا؟

(i) پانچ	(ii) سات
(iii) آٹھ	(iv) نو

(و) اِستنبول کا فاتح کون ہے؟

(i) حضرت ابوایوب انصاری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ (ii) سلطان محمد فاتح

(iii) مرادثانی (iv) محمد ثانی

(ز) اِستنبول کو کس کا گھر کہا جاتا ہے؟

(i) عجائب گھروں کا (ii) مسجدوں کا

(iii) کتب خانوں کا (iv) مقبروں کا

(ح) مسجد سلیمانیہ کے ساتھ کُتب خانے میں کتنے قلمی نسخے ہیں؟

(i) تیس ہزار (ii) پچاس ہزار

(iii) ایک لاکھ (iv) ڈیڑھ لاکھ

۴۔ سبق ''اِستنبول'' کے متن کے مطابق کالم (الف) کے الفاظ کا ربط کالم (ب) کے الفاظ سے کریں:

کالم (الف)	کالم (ب)
دوسرا مینار	حضرت ابوایوب انصاریؓ
توپ کاپی	سلطان محمد فاتح
فاتح اِستنبول	سلیم ثانی
آٹھ لوحیں	ولیم راجرز
چھے مینار	مصطفیٰ عزت آفندی
تین نمایاں چیزیں	جامع سلطان احمد

۵۔ متن کی روشنی میں قوسین میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) سلطان محمد فاتح گھوڑے سے اتر کر.................... میں داخل ہوا۔ (مسجد، غار، محل، کلیسا)

(ب) پورے شہر میں.................... مساجد ہیں۔ (چار سو، پانچ سو، چھے سو، ایک ہزار)

(ج) ترکی کے وزیرِ اعظم جناب ترگت اوزال ہمارے.......... تھے۔ (ہمراہ، میزبان، مہمان، مہربان)

(د) سلیمانیہ سے ملحق ایک بڑا.................... ہے۔ (کتب خانہ، مدرسہ، کالج، عجائب گھر)

(ہ) جامع سلطان احمد اپنے.................... میناروں کی وجہ سے مشہور ہے۔ (چار، چھے، آٹھ، دس)

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

مُحاصرہ، جلیلُ القدر، مدفُون، سُرمئی، مُنہدِم، تنظیم، مخطُوطَہ، مُسوّدہ، کاشانہ، قضاوقدر، مَربَع

۷۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

سرگرمیاں

۱۔ آپ کو اِستنبول کی جو بات سب سے زیادہ پسند آئی ہو، اُسے کاپی میں لکھ کر اپنے استاد کو دکھائیں۔

۲۔ سبق میں مسجد سلیمانیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے ایک پیراگراف لکھیں۔

۳۔ طلبہ اپنے کسی سفر کے حالات اور تاثرات ومشاہدات مختصراً اپنی کاپی میں لکھیں اور اپنے استاد کو دکھائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو سفرنامے کی صنف کا بھرپور تعارف کرایا جائے کہ یہ ادب، جغرافیے اور تاریخ وغیرہ کا مجموعہ ہے اور اس میں معلومات کے ساتھ ساتھ حیرت اور تجسس کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔

۲۔ نقشے کی مدد سے طلبہ کو اِستنبول اور ترکی کا محلِ وقوع بتایا جائے۔

۳۔ ترکی اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں طلبہ کی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔

۴۔ ترکی کے کسی اور سفرنامے کے کچھ حصے جماعت کے کمرے میں طلبہ کو سنائے جائیں۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ
(۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء)

مرزا غالبؔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام مرزا اسداللہ خاں بیگ تھا۔ پہلے اسدؔ بعد میں غالبؔ تخلّص اختیار کیا۔ پانچ سال کی عمر میں مرزا کے والد عبداللہ بیگ فوت ہوگئے۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی۔ تیرہ برس کے تھے کہ امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہوگئی۔ غالبؔ نے ابتدائی تعلیم آگرہ میں حاصل کی۔ ان کے سسرال دہلی میں تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ بھی دہلی منتقل ہوگئے۔

غالبؔ کو انگریزی سرکار سے باسٹھ روپے چار آنے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ یہ رقم ان کے اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ بعض اُمرا ان کی مالی مدد کیا کرتے تھے، پھر بھی غالبؔ ہمیشہ معاشی تنگ دستی کا شکار رہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے تعلّق پیدا ہوا۔ خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے کے عِوض پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔ ۱۸۵۴ء میں ذوقؔ کے انتقال پر بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد مقرر ہوئے۔ مرزا غالبؔ نے ۱۵/فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں وفات پائی۔

مرزا غالبؔ ایک نابغۂ روزگار شخص تھے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، صاحبِ اسلوب نثر نگار اور اعلیٰ درجے کے تاریخ نویس تھے۔ فارسی زبان کا خداداد ذوق رکھتے تھے۔ غالب کے بقول: ''ان کا فارسی کلام، اردو شاعری سے بھی زیادہ اونچے درجے کا ہے۔'' اگرچہ شہرت انھیں اپنے اردو دیوان ہی سے ملی۔

مرزا غالبؔ نے مکتوب نویسی میں بھی اپنی الگ راہ نکالی۔ ان کی جِدّت پسندی نے اردو نثر کو نیا انداز و آہنگ عطا کیا۔ انھوں نے خطوں کے رسمی انداز کو ترک کیا اور خط کو بے تکلفانہ گفتگو اور شخصی، دلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ خود کہتے ہیں: ''مَیں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔''

ان کے خطوں کا ایک مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے ۱۸۶۸ء میں شائع ہوگیا تھا، دوسرا مجموعہ اردوے مُعلّیٰ ان کی وفات کے مہینا بھر بعد چھپ کر آیا۔ دیوانِ غالب کے علاوہ ان کی زیادہ تر تصانیف دَستَنبو، پَنج آہنگ، مِہرِ نیم روز، قاطِعِ بُرہان وغیرہ فارسی زبان میں ہیں۔

خطوطِ غالبؔ

تدریسی مقاصد

۱۔ ایک مؤثر ذریعۂ ابلاغ کے طور پر مکتوب نگاری کی اہمیت واضح کرنا۔
۲۔ غالب کی مکتوب نگاری کے منفرد انداز کا تعارف کرانا۔
۳۔ طلبہ کو خط کے مختلف حصّوں (پیشانی، القاب و آداب وغیرہ) کی ضرورت اور اہمیت سمجھانا اور بتانا کہ غالبؔ نے روایتی انداز نہیں اپنایا۔
۴۔ طلبہ کو اپنا مافی الضمیر بلا تکلف لکھنے کے لائق بنانا۔

(۱)

منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام

اللّٰہ اللّٰہ! ہم تو کول سے تمھارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگاہ کل جو خط آیا، معلوم ہوا کہ دو دن کول ① میں رہ کر سکندر آباد ② آ گئے ہو اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھیے: اب یہاں کب تک رہو اور آگرہ کب جاؤ۔ پرسوں برخوردار شیونرائن ③ کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔ اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر ④ بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے! کس دن کتابیں آ جائیں۔ خدا کرے سب کام دل خواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب! منشی بالمکند بے صبرؔ ⑤ کے ایک خط کا جواب ہم پر فرض ہے۔ مَیں کیا کروں؟ اُس خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا۔ بس مَیں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہ دینا اور مطبع آگرہ ⑥ سے کتابوں کا حال تم خود دریافت کر ہی لو گے، میرے کہنے اور لکھنے کی کیا حاجت؟

چار شنبہ، سوم نومبر ۱۸۵۸ء — غالبؔ

۱۔ کول، علی گڑھ کا پرانا نام ہے۔
۲۔ سکندر آباد، ضلع بلند شہر (یوپی) کا ایک شہر ہے۔
۳۔ منشی شیونرائن آرام آگرہ میں رہتے تھے، جہاں انھوں نے ایک پریس لگا لیا تھا۔ انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔
۴۔ مرزا مہر، غالبؔ کے دوست تھے۔ ان کا پورا نام مرزا حاتم علی بیگ تھا۔ وکیل اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔
۵۔ منشی بالمکند بے صبرؔ سکندر آباد کے باشندے تھے۔ محکمہ مال میں منشی گری اور داروغہ کے منصب پر مقرر تھے۔ غالب سے روابط تھے۔
۶۔ مطبع آگرہ منشی شیونرائن کی ملکیت تھا اور یہاں غالبؔ کی کتاب دستنبو چھپ رہی تھی۔

(۲)

کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہُوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دِلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہُوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔ بہ ہر حال:

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم [1]

کل جمعے کے دن بارہ تاریخ نومبر کی، تینتیس جلدیں، بھیجی ہوئی برخوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا سب خوب۔ دل خوش ہوا اور شیونرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں، منشی شیونرائن نے اندور کو، واسطے رائے امید سنگھ کے، کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں؟

صاحب! تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو۔ سکندر آباد کب تک رہو گے؟ آگرے کب جاؤ گے؟

شنبہ، ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

جواب طلب

غالبؔ

(۳)

میر مہدی حسین مجروح کے نام

بھائی!

نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے، اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہُوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہُوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے، آج کاغذ اور ٹکٹ منگا لوں گا۔ سہ شنبہ ۸۔ نومبر صبح کا وقت ہے، جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمھارا خط آیا تھا، آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں، اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین [2] پر ان کی بیٹی کا قدم مبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے ڈھونڈا نہ جائے گا، ہاں عظیم النسا بیگم نام اچھّا ہے کہ اس میں ایک رعایت ہے، شاہ محمد عظیم صاحب رحمتہ اللّٰہ کے نام کی۔ مجتہد العصر [3] کو میری دُعا کہنا۔ تم کو کیا ہُوا ہے کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے؟ یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب [4] کو بہت بہت دُعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔

۱۔ ترجمہ: کوئی سنے یا نہ سُنے مَیں تو اپنی بات کہہ دیتا ہوں۔ ۲۔ میر نصیر الدین، مولانا فخر الدین فخرِ عالم کے خلیفہ شاہ محمد عالم کی اولاد سے تھے۔

۳۔ ''مجتہد العصر'' سے مراد ہے میر سرفراز حسین (میر مہدی حسین مجروحؔ کے بھائی) جو مرزا غالبؔ کے عزیز دوست تھے۔

۴۔ میرن صاحب کا اصل نام میر افضل علی تھا۔ لکھنؤ میں مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ غالبؔ کے دوست تھے۔

شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ ''پون ٹوٹی [1] کوئی چیز ہے، وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہوجائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑتک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔ حاکمِ اکبر کی آمد سُن رہے ہیں۔ دیکھیے دلّی آئیں یا نہیں؟ آئیں تو دربار کریں یا نہیں؟ دربار کریں تو میں گنہ گار بلایا جاؤں یا نہیں؟ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں؟ پنسن کا تو نہ کہیں ذکر ہے، نہ کسی کو خبر ہے۔

سہ شنبہ، ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء　　　　غالبؔ

(غالبؔ کے خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) مرزا غالبؔ نے میر مہدی حسین مجروحؔ کو خط، بیرنگ کیوں بھیجا؟

(ب) مرزا غالبؔ نے میر مہدی مجروحؔ کو خط کب لکھا؟

(ج) کون سی دو چیزوں پر محصول وصول نہیں کیا جاتا تھا؟

(د) مرزا غالبؔ نے کتابوں پر کیا رائے دی ہے؟

(ہ) تفتہؔ نے غالبؔ کو خط کہاں سے لکھا تھا؟

۲۔ درست جواب پر نشان (✓) لگائیے:

(الف) میر مجروحؔ کے خط میں کس کی بیٹی کی پیدائش کا ذکر ہے؟

(i) میر مجروح　　(ii) میر نصیر الدین
(iii) میرن　　(iv) شاہ محمد عظیم

(ب) ''پون ٹوٹی'' (چُنگی) کس چیز پر معاف تھی؟

(i) ترکاری اور پھل　　(ii) اناج اور اُپلے
(iii) غلہ اور ترکاری　　(iv) پھل اور اُپلے

(ج) مرزا غالبؔ کو تفتہؔ کا خط کہاں سے آتا تھا؟

(i) کلکتہ　　(ii) سکندر آباد
(iii) کول　　(iv) آگرہ

۱۔ اصل میں یہ لفظ ''ٹاؤن ڈیوٹی'' (Town Duty) ہے۔ اس سے مراد محصول چنگی ہے۔

(د) کس شخص نے کتابوں کی شیرازہ بندی کے بارے میں مرزا کو خط لکھا تھا؟

(i) تفتہ (ii) میرن

(iii) میر مہدی مجروح (iv) شیونرائن

(ہ) دوسرے خط کے مطابق مرزا غالبؔ کو کتنی کتابیں موصول ہوئیں؟

(i) بیس (ii) تینتیس

(iii) تیس (iv) تینتالیس

(و) مرزا غالب نے تفتہؔ کو دوسرا خط کب لکھا؟

(i) ۳۔نومبر ۱۸۵۸ء (ii) ۱۳۔نومبر ۱۸۵۷ء

(iii) ۱۳۔نومبر ۱۸۵۸ء (iv) ۲۳۔نومبر ۱۸۵۸ء

۳۔ ''خطوطِ غالبؔ'' کے متن کو ذہن میں رکھ کر درست یا غلط پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) مرزا غالبؔ نے میر نصیرالدین کو بیٹی کی پیدائش پر مبارک باد دی۔ درست/غلط

(ب) تیسرے خط میں دارالبقا کے فنا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ درست/غلط

(ج) مرزا غالبؔ نے تفتہ کو پہلا خط لکھا تو تفتہؔ کول میں تھے۔ درست/غلط

(د) مرزا غالب کو کتابیں ۱۲۔نومبر ۱۸۵۸ء کو ملیں۔ درست/غلط

(ہ) دوسرے خط میں دلّی کے خاک نشینوں سے مراد خود مرزا غالب کی ذات ہے۔ درست/غلط

۴۔ ان جملوں کی وضاحت کریں:

(الف) دارالبقا فنا ہو جائے گا، رہے نام اللہ کا۔

(ب) حاکمِ اکبر کی آمد سن رہے ہیں۔

(ج) منشی بالمکند بےصبرؔ کے ایک خط کا جواب ہم پر فرض ہے۔

(د) کیا یہ آئین جاری ہوا ہے؟

(ہ) خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔

۵۔ کالم (الف) کے الفاظ کالم (ب) سے ملائیں:

کالم (الف)	کالم (ب)
پہلا خط	میر مہدی حسین مجروح
شیونزائن	میر نصیر الدین
دوسرا خط	خلیق انجم
دار البقا	کتابوں کی شیرازہ بندی
غالب کے خطوط	فنا
بیٹی کا قدم مبارک	ہر گوپال تفتہ

۶۔ مندرجہ ذیل پر اعراب لگائیے:

مجروح، تفتہ، مجتہد العصر، برخوردار، تحویل

سرگرمیاں

۱۔ خطوط میں جن شخصیات کا ذکر آیا ہے، اساتذہ سے پوچھ کر ان کا مختصر تعارف خوش خط لکھ کر جماعت کے کمرے میں آویزاں کریں۔

۲۔ مرزا غالبؔ کے خطوط کی تین خوبیاں لکھ کر جماعت کے کمرے میں نمایاں جگہ پر لگائیں۔

۳۔ مرزا غالبؔ کے دو اور آسان سے خطوط جماعت کے کمرے میں پڑھے جائیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ مکتوب نگاری کے فن سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

۲۔ غالبؔ نے مکتوب نگاری کا نیا ڈھنگ اختیار کیا، مزید خطوط کی روشنی میں طلبہ کو اس ڈھنگ سے آگاہ کریں۔

۳۔ غالبؔ کی مکتوب نگاری کے مزید نمونے طلبہ کو دکھائے جائیں۔

۴۔ غالبؔ کے خطوط پر مشتمل چند کتب لائبریری سے لا کر طلبہ کو دکھائی جائیں۔

رشید احمد صدیقی
(۱۸۹۶ء-۱۹۷۷ء)

رشید احمد صدیقی اتر پردیش کے قصبے مریاہو ضلع بلیا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جون پور چلے گئے، جہاں انھوں نے ۱۹۱۴ء میں انٹرنس پاس کیا۔ گھریلو حالات سازگار نہ تھے، اس لیے انٹر اور بی اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ کئی ملازمتیں بھی کرنی پڑیں۔ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے ایم اے (اردو) امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں یہیں سے بطور صدرِ شعبۂ اُردو سبک دوش ہوئے۔ بقیہ عمر علی گڑھ ہی میں گزری اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

رشید احمد صدیقی ایک صاحبِ طرز اِنشا پرداز تھے۔ بنیادی طور پر وہ طنز و مزاح نگار تھے۔ سنجیدہ مزاح اور طنز و ظرافت میں وہ ایک مُنفرِد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہایت خوب صورت شخصی مُرقّعے بھی لکھے ہیں۔ ان کی غیر افسانوی اور تنقیدی نثر کے مرکزی موضوعات میں علی گڑھ، اردو غزل، تحریکِ سرسید اور بعض تہذیبی موضُوعات شامل ہیں۔ ان کے خطوں کے تقریباً ایک درجن مجموعے چھپ چکے ہیں، جو ان کی انشا پردازی کے عمدہ نمونے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی تصانیف میں: طنزیات و مُضحِکات، مضامینِ رشید، آشفتہ بیانی میری، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، جدید غزل، غالب کی شخصیت اور شاعری، اقبال کی شخصیت اور شاعری اور خنداں شامل ہیں۔

خطوط رشید احمد صدیقی

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ پر مکتوب نگاری کی اہمیت واضح کرنا۔
۲۔ طلبہ کو رشید احمد صدیقی کے خطوط کی روشنی میں ان کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں سے آگاہ کرنا۔
۳۔ رشید احمد صدیقی کی مکتوب نگاری کے منفرد پہلوؤں کا تعارف کرانا۔
۴۔ طلبہ کو دیے گئے خط کے ذریعے سے تعزیت نامہ لکھنا سکھانا۔
۵۔ طلبہ کو تحریر کے ذریعے سے مافی الضمیر ادا کرنے کا سلیقہ سکھانا۔

بنام ڈاکٹر محمد حسن

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

اتوار، ۲۷۔فروری ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر صاحب محترم! سلام شوق

سب سے پہلے نوازش نامے ہی سے ۲۴۔فروری کو خوش خبری [1] مل گئی تھی لیکن احتیاط کے خیال سے اس کا ذکر گھر والوں سے بھی نہیں کیا۔ چاہتا تھا کہ تصدیق ہو جائے تو سب سے پہلے آپ کی محبت کا شکریہ ادا کروں گا۔ رات ریڈیو سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ انعام پانے کی خوشی اپنی جگہ پر رہی لیکن اس سے بھی کچھ کم متاثر نہیں ہوں کہ آپ کو میرا اتنا خیال رہا۔ سوچتا ہوں، جب سے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے سابقہ ہوا، آپ کی خدمات (احسانات) کی تعداد، مقدار اور قدر و قیمت میری ان چھوٹی موٹی باتوں سے کہیں زیادہ ہیں، جو آپ کے لیے میں نے کبھی کبھار کی ہوں گی۔ آپ کی شرافت، قابلیت اور دیرینہ وضع داری کا مجھے جو احساس ہے، میرا خیال ہے کہ آپ کے لیے کسی دوست، عزیز اور بزرگ سے کم نہیں ہے۔ ان نظام خطبات کو شہرت دینے اور کامیاب بنانے میں آپ کا گراں قدر حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش، نیک نام اور اقبال مند رکھے، آمین۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کو بہت بہت دعا۔

خدا حافظ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے ملنے والے اعزاز کی طرف اشارہ ہے۔

بنام ظہیر احمد صدیقی

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۰۔ جولائی ۱۹۷۳ء

عزیزِ گرامی! دعا

مولانا ضیا احمد صاحب مرحوم آپ کے والدِ محترم میرے اور کتنے ہی دوسروں کے رفیق و شفیق تھے۔ مرحوم کے سانحۂ رحلت پر آپ کو اور ہم سب کو جو صدمہ ہوا ہے، اس کا اندازہ ہم سے، آپ سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا ہے۔ مرحوم کے سایۂ شفقت میں آپ زندگی کے مُعظّمات سے بہرہ مند ہوئے اور سب کی نظروں میں ممتاز و مُفتخر ہیں۔ کتنی بڑی یہ سعادت آپ کو نصیب ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ مرحوم سے شاید ہی کبھی کسی شخص کو تکلیف پہنچی ہو۔ شریف شخص کی یہ صفت سب سے معتبر مانی گئی ہے۔ اُردو، فارسی اور عربی ادبیات پر مرحوم کی نظر بڑی گہری، وسیع اور مُتنوّع تھی جس کے ہم سب ہمیشہ معترف رہے اور اس سے اِستفادہ کیا۔ نا ملائم الفاظ کبھی زبان پر نہیں لائے۔ بڑے شوق اور سنجیدگی سے علمی مسائل پر اظہارِ خیال فرماتے۔

مرحوم کی مُفارَقت سے مشرقی ادب اور آداب کی محفل میں جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ مستقبل قریب میں شاید ہی پُر ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو سایۂ رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

مخلص
رشید احمد صدیقی

بنام پروفیسر سید بشیر الدین

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ
شنبہ، ۳۔ نومبر ۱۹۷۳ء

بشیر صاحب، مکرم!

آداب!

۲۷/ اکتوبر کا نوازش نامہ مل گیا تھا۔ جواب میں دیر ہوگئی، ورنہ خطوط کا جواب عموماً ہم روزہ دیتا ہوں۔ اپنے اوپر کسی قسم کا بقایا نہیں رکھنا چاہتا۔ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے تو کوئی یہ نہ کہے کہ مجھ پر اس کا کچھ واجب الادا تھا۔

کچھ دنوں سے ہجوم میں تنہائی کا احساس ہونے لگا ہے جو روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے۔

آپ نے خود اپنے، اپنے مطالعے، اپنے اشغال، علی گڑھ کی زندگی اور الٰہ آباد کے موجودہ شب و روز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی تصدیق کرتا ہوں، اس لیے کہ زمانہ اور زندگی کے تقریباً اسی طرح کے سرد و گرم سے مَیں بھی گزر رہا ہوں۔ کچھ احوال بدلے ہوئے ملیں گے لیکن ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ صدی کی ابتدا میں تقریباً ۳۰، ۴۰ سال تک ہر متوسّط مسلمان گھرانے کا یہی نقشہ رہا ہے۔ ان خاندانوں کی کچھ

مشترک خصوصیات و روایات اور رجحانات تھے، جن کا سرچشمہ مذہب، اخلاق، تاریخ اور تہذیب تھی، جن کی پیروی اطراف وجوانب میں دور دور کی جاتی تھی۔ کسی نہ کسی حد تک اب بھی کی جاتی ہے اور اس کے بھلے یا برے نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان خصوصیات کے نمونے اور نمایندے ہر مشترک خاندان کے افراد میں کچھ دنوں پہلے تک مل جاتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر یا مُشترک مکتبوں (بالعموم مساجد) میں ہوتی تھی۔ مزید مطالعے کا کام گھر کے مختصر ذخیرۂ کتب سے لیا جاتا، جن میں مذہبی، اخلاقی اور تفریحی کتابیں ہوتیں۔ گھر کی یا گھریلو کتابیں اور عزیزوں اور بزرگوں کے شریفانہ طور طریقے اور ان کی دی ہوئی روایات ہوتیں جو ابتدائی عمر کی ہماری تخیّل (Imagination) کو گرمی اور جولانی بخشتیں۔ اسی تخیّل کو لیے ہوئے ہم یا یہ تخیّل ہم کو لیے ہوئے علی گڑھ میں داخل ہوئی۔ یہاں سے وہ کرشمۂ انقلاب یا قلبِ ماہیت شروع ہوتی ہے جس کا دوسرا نام علی گڑھ ہے۔ جو باتیں اس سے پہلے خواب میں دیکھی تھیں، ان کی تصویر وتکمیل علی گڑھ میں دیکھی اور پائی۔ اسلاف کی عظمت، خاندان کے بزرگوں کی شفقت اور سہارا اور ساتھیوں کی شرافت، سخاوت اور آرزومندی سے آشنا اور بہرہ مند ہوا۔ ان کے ساتھ رہنے اور رنج وراحت میں شریک ہونے میں اپنی بڑائی دیکھی۔ پھر جو کچھ ہوا، وہ مَیں اور آپ اپنی اپنی زندگی میں دیکھ کر اپنے کو مبارک باد دیں اور خوشی اور فخر محسوس کریں تو کیا حرج!

جو باتیں اوپر عرض کی ہیں، کیا میری طرح آپ پر، یا آپ کی طرح مجھ پر نہیں گزری ہیں؟ جن کتابوں اور سربراہوں نے آپ کو متاثر کیا، کم وبیش اُنھی نے مجھے بھی کیا۔ مَیں معلّم بنا، آپ کو کتابوں کی دولت اور امانت سونپی گئی۔ آپ نے اس کا حق ادا کر دیا جس کا ثبوت آپ کی ہندوستان گیر شہرت اور آپ کے مشورے اور مدد کی ہر طرف سے مُتواتر اور مسلسل مانگ (Demand) رہی ہے۔ آپ کے انگریزی اور وسیع ومُتنوّع مطالعے کا ہر وہ شخص مُعترف ہے جو آپ کو جانتا ہے۔ آپ نے لائبریری کے تقاضوں کو ایک مُہتمم اور ایک جویائے علم دونوں کی حیثیت سے پورا کر دیا۔ علی گڑھ سے یہ بہت بڑی نسبت ہے، جس سے آپ مدّتوں یاد رکھے جائیں گے۔

علی گڑھ کا آپ کا مطالعہ قابلِ غور ہے۔ آپ کے دل میں علی گڑھ کی وہی قدر وقیمت ہے جو ہندوستان کے باہر کے اہلِ علم وفن کی ہوسکتی ہے اور ہے لیکن کیا کیجیے کہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اچھی اور بڑی چیز کا احترام کرنے کی اِستعداد سے محروم ہو چکے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کو صرف علی گڑھ کے طفیل، وہ اختیار واقتدار اور دولت نصیب ہوئی، جس کا وہ علی گڑھ سے دور رہ کر خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

بشیر صاحب! بہت کچھ اور لکھنا چاہتا تھا لیکن تھک گیا۔

اچھا بشیر صاحب! خدا حافظ۔ مُتعلّقین کو دعا۔ محترمہ بیگم صاحبہ کو سلام

مخلص

رشید احمد صدیقی

(خطوطِ رشید احمد صدیقی مرتب: ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تحریر کیجیے:

(الف) رشید احمد صدیقی کے پہلے خط کے مخاطَب کا نام کیا ہے؟

(ب) ''خطوط کا جواب عموماً ہم روزہ دیتا ہوں'' اس سے کیا مراد ہے؟

(ج) مکتوب نگار نے خاندانوں کی مشترک خصوصیات وروایات کا سرچشمہ کس چیز کو قرار دیا ہے؟

(د) ظہیر احمد صدیقی کے نام مکتوب میں کس شخصیت کی وفات پر اظہارِ تعزیت کیا گیا ہے؟

(ہ) ڈاکٹر محمد حسن کا شکریہ کس بات پر ادا کیا گیا ہے؟

۲۔ متن کی روشنی میں قوسین میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) رشید احمد صدیقی نے اپنے خوابوں کی تعبیر.................. میں پائی۔ (کلکتہ، علی گڑھ، دہلی)

(ب) سید بشیر الدین لائبریری کے مہتمم کے علاوہ.................. بھی تھے۔ (مُتعلّم، مُعلّم، علم کے متلاشی)

(ج) رشید احمد صدیقی بشیر احمد صاحب کو مزید لکھنا چاہتے تھے، مگر..................۔

(انھیں نیند آ گئی، وہ تھک گئے، ایک اور کام میں مصروف ہو گئے)

(د) صدیقی صاحب نے.................. کے والد صاحب کی وفات پر انھیں تعزیتی خط لکھا۔

(ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، سیّد بشیر الدین)

(ہ) رشید احمد صدیقی کو ۲۴۔فروری ۱۹۷۳ء کو ایک.................. ملی۔ (خوش خبری، رجسٹری، بدخبری)

۳۔ سبق ''خطوطِ رشید احمد صدیقی'' کا متن مدِّنظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) رشید احمد صدیقی نے خطوط کس شہر سے بھجوائے؟

(i) دِلّی (ii) علی گڑھ

(iii) لاہور (iv) لکھنؤ

(ب) رشید احمد صدیقی نے اپنے خط میں کس کے گراں بار احسانات کا شکریہ ادا کیا؟

(i) مولانا ضیا احمد (ii) ڈاکٹر محمد حسن

(iii) ظہیر احمد صدیقی (iv) سید بشیر الدین

(ج) رشید احمد صدیقی نے خط میں کس کے سانحۂ رحلت کا ذکر کیا ہے؟

(i) مولانا ضیا احمد (ii) بیگم ڈاکٹر محمد حسن

(iii) برادر سید بشیر الدین (iv) بیگم سید بشیر الدین

(د)　مکتوب نگار نے اپنے خط بنام ڈاکٹر محمد حسن میں کس خوش خبری کا ذکر کیا ہے؟

(i) غالب ایوارڈ ملنے کی　(ii) تصنیف پر نقد رقم ملنے کی

(iii) محکمانہ ترقی کی　(iv) ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ملنے والے اعزاز کی

(ہ)　خط بنام پروفیسر بشیر الدین میں کن لوگوں کی احترام کرنے کی صلاحیت سے محرومی کا ذکر کیا ہے؟

(i) علم وعمل سے خالی　(ii) احترام کے مفہوم سے نابلد

(iii) علی گڑھ کی ناقدری کرنے والے　(iv) مادیت پسند

(و)　''بہت کچھ اور لکھنا چاہتا تھا لیکن تھک گیا'' صدیقی صاحب نے یہ جملہ کس کے نام لکھا؟

(i) ظہیر احمد صدیقی　(ii) سید بشیر الدین

(iii) ڈاکٹر محمد حسن　(iv) مولانا ضیا احمد

۴۔　درجِ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

اِستعداد، کرِشمہ، اَسلاف، مُتنوّع، اَشغال، مُہتمم، طُفیل، سَعادَت، مُعظّمات

۵۔　کالم (الف) کے اندراجات کو کالم (ب) سے ملائیے:

کالم (الف)	کالم (ب)
تعزیت نامہ	علی گڑھ یونیورسٹی
ہجوم میں	مشترک مکتبوں
رشید احمد صدیقی	بنام ظہیر احمد صدیقی
ابتدائی تعلیم وتربیت	تیسرا خط
۳۔نومبر ۱۹۷۳ء	احساسِ تنہائی

۶۔　درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

اسلاف، نیک نام، سخاوت، اِعتراف، آباد، نشیب

اردو زبان اور مختلف اندازِ بیاں:

معاشرے میں ہمیں بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی سوچ، سمجھ، علم اور تجربے کی روشنی میں گفتگو کرتا ہے۔ گویا ایک ہی بات کے اندازِ بیاں مختلف ہو سکتے ہیں۔ آپ کمرے میں بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کھڑکی بند کردی

جائے۔ دیگر لوگ بھی موجود ہیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھے نوجوان سے لوگ کیا کہیں گے؟

ایک بزرگ: برخوردار! ذرا کھڑکی تو بند کر دیں۔

نوجوان: پلیز کھڑکی بند کر دیجیے۔

ایک اور: کھڑکی بند کر دو۔

ایک اور نوجوان: اگر زحمت نہ ہو تو یہ کھڑکی بند کر دیں، ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔

اس کے علاوہ بھی ہم کئی اور انداز میں زبان لکھتے اور بولتے ہیں، مثلاً:

(الف) گاڑی تیز چلانے کی بنا پر آپ کا کوڈ گیارہ کے تحت چالان کیا جاتا ہے۔

(ب) آپ کا تبادلہ زیرِ چٹھی نمبر ۲۱۲/ای بتاریخ ۲۳۔ اگست ۲۰۱۳ء میں کر دیا گیا تھا۔

(ج) کرکٹ ٹیم ۲۳۳ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ سیریز جیتنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔

(د) کمپیوٹر کے سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کا فرق معلوم ہونا چاہیے۔

آپ نے دیکھا کہ اخباری، دفتری، قانونی اور تکنیکی زبان کافی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہمارا ہر جملہ اپنے لب و لہجے، اسلوب اور لفظوں کے انتخاب کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مضمون، کہانی، خط اور درخواست لکھنے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔

آپ مختلف جملے بول کر یا لکھ کر بتائیں کہ، یہ کون سا اندازِ بیاں ہے؟

سرگرمیاں

۱۔ رشید احمد صدیقی کے دو تین اور خطوط جماعت کے کمرے میں سنائے جائیں۔

۲۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط میں علی گڑھ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسے اپنے لفظوں میں پیراگراف کی صورت میں لکھیں۔

۳۔ اپنے استاد صاحب سے پوچھ کر رشید احمد صدیقی کی نثر نگاری کی دو خاص خوبیاں لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ کسی شخص کے خطوط اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی کس طرح عکاسی کرتے ہیں؟

۲۔ رشید احمد صدیقی کے کسی مجموعے سے ان کے دو تین خطوط پڑھ کر طلبہ کو سنائے جائیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا جائے۔

۳۔ طلبہ کو خطوط نویسی کی مشق کرائی جائے۔

اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے

شگفتہ صغیر الحسنین ترمذی

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے

عباس جب صبح بیدار ہوا تو نماز پڑھ کر جلدی جلدی سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ سکول پہنچ کر اُس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ رات اُس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ بندوق اور قلم میں بحث و تکرار ہو رہی تھی اور آخر کار فتح قلم کو ہوئی۔ سب دوستوں نے پوچھا! اچھا وہ خواب کیا تھا تو عباس نے قلم اور بندوق کے متعلق اپنا خواب سناتے ہوئے کہا کہ:

قلم اور بندوق دونوں پڑوسی تھے۔ ان کے درمیان اکثر کسی نہ کسی بات پر تکرار ہو جاتی، جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قلم بندوق کو ہمیشہ بُرے کاموں سے منع کرتا۔ ایک مرتبہ قلم کو اہلِ علم کی محفل میں شرکت کے لیے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔ وہاں اس کا قیام خاصا طویل ہو گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو ملک کا عجیب حال تھا۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ کیا بچے کیا بڑے بوڑھے سب بندوق اور اس کے بُرے دوستوں (بم، خنجر، پستول وغیرہ) کی شیطانیوں سے خوف زدہ تھے۔ ان کے پھیلائے ہوئے خوف وہراس سے سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں دیکھو اور سنو گولیاں چلنے اور بم دھماکوں کی خبروں سے کہرام مچا ہوا تھا۔ قلم کو اپنے وطنِ عزیز کی اس حالت پر بے حد دکھ ہوا اور اس نے بندوق کو للکار کر کہا:

ٹھہر اے بُزدل! تجھے کچھ خُدا کا خوف نہیں، جو تو اِس طرح انسانیت کا قتلِ عام کر رہی ہے؟ جوان، بوڑھے اور عورتیں حتیٰ کہ اب تو معصوم بچوں کے سکول بھی تیری شیطانیت سے محفوظ نہیں۔

اری ظالم! دیکھتے ہی دیکھتے تُو نے ہمارے ہرے بھرے آشیانے کو ویران کر دیا ہے۔

بندوق نے کہا: واہ رے قلم! کیسا خوف اور کیسی شیطانیت؟ کبھی تم لوگوں نے اپنے طرزِ عمل پر نگاہ ڈالی ہے؟ کبھی سوچا ہے ان مسائل کی اصل وجہ کیا ہے؟

قلم بولا: اری او شیطان! کیا کہنا چاہتی ہو؟ ان بے گناہ لوگوں کے خون کا الزام تم ہم پر کیسے لگا سکتی ہو؟

بندوق نے کہا: کیا تم نے نہیں سنا؟

؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قلم نے گرج کر کہا: اس بات کی وضاحت کرو۔ اپنے گناہوں پر پردہ نہ ڈالو میں تو پہلے ہی تیری اور تیرے دوستوں کی شیطانیت سے عاجز تھا۔

بندوق نے کہا او ہو اچھا! ؎ کہاں تک سنو گے کہاں تک سُناؤں؟

تم اور تمھارے لوگوں کے اتنے مسائل ہیں کہ ڈھیر لگا ہوا ہے، میں نے صرف اِن مسائل کا فائدہ

اٹھایا ہے اور چنگاری لگا کر ہوا دی ہے ۔

قلم نے ناراض ہوتے ہوئے کہا: صاف صاف بتاؤ اور کھل کر بات کرو۔ تم نے کن مسائل کا فائدہ اٹھایا ہے؟ اور تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم نے صِرف چنگاری کو ہوا دی ہے؟

بندوق نے طنزاً کہا: واہ رے تیری معصومیت! اتنے نادان نہ بنو، کیا تم نہیں جانتے یہاں ہر کوئی ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے؟ مثلاً غریب جاگیر دار سے نالاں ہے تو جاگیر دار غریب پر خار کھائے بیٹھا ہے۔ کہیں رنگ و نسل پر تُو تُو مَیں مَیں ہے تو کہیں تفرقہ بازی عروج پر ہے۔ ہر کوئی اپنے مقصد کے لیے مذہب میں اپنے اپنے راستے بنائے بیٹھا ہے۔ مذہب کی اصل حقیقت جو تمھارے اللہ اور رسولؐ نے بتائی ہے تم سب بھول گئے ہو؟ تم لوگ تو اپنے پڑھنے پڑھانے کی درخشاں روایت کو بھی نظر انداز کر بیٹھے ہو۔ غربت کا یہ عالم ہے کہ چند روپوں کے لیے مفاد پرست لوگ ہر طرح کی دہشت گردی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بس میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ انہی اختلافات کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب تم خود بتاؤ میں نے کیا غلط کیا؟

قلم بولا: کیا تم اور تمھارے دوست یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے مسائل حل نہیں کر رہے اور اس سلسلے میں کوئی کام نہیں کر رہے؟

بندوق نے کہا: تمھارے کام ہاہاہا! میں یہ بھی تمھیں بتائے دیتی ہوں۔ تمھارے مسائل اتنے ہیں کہ اگر تم سب مل کر بھی کوشش کرو تو ان مسائل کو حل کرتے کرتے برسوں سر نہ اٹھا سکوگے۔ مگر تمہارا یہ حال ہے کہ کام کرنے والے گنتی کے چند لوگ ہیں۔ زیادہ تر لوگ طنز و تنقید بھرے دُھواں دار جملے بولتے ہیں اور پھر افسوس کے بعد بسکٹ چائے پی کر رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ہم جیسے لوگوں کا بَھلا کر جاتے ہیں۔

قلم بولا: بس کرو اے نادان! اب میں تمھاری دال زیادہ دیر گلنے نہیں دوں گا۔ تجھے اور تیرے شیطان دوستوں کو اپنی پاک سرزمین سے نکال کر ہی دم لوں گا۔ اب دیکھ میں تجھے برباد کرنے کے لیے کیا کیا کرتا ہوں؟

قلم پریشانی سے اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچ میں گم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے ہوئے کہنے لگا:

یا اللہ! میری مدد فرما! کہ میں کیسے اِس مصیبت سے اپنے وطنِ عزیز کو نجات دِلاؤں؟

اچانک اس کی نظر قریب پڑی کتاب کی اس تحریر پر پڑی: ؎ اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے

جب کہ دوسری جگہ لکھا تھا: ؎ ہمّتِ مرداں، مددِ خدا

بس پھر کیا تھا کہ قلم نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اپنے وطنِ عزیز کے ہر کوچے، گاؤں، شہر اور کونے کونے میں جائے گا اور اِن مسائل کے حل کے لیے اپنی جان کی بازی تک لگادے گا اور کسی بھی طرح بندوق اور اُس کے شیطان دوستوں کے ناپاک اِرادوں کو کامیاب نہ ہونے دے گا۔ وہ یہ ثابت کردے گا کہ قلم کی طاقت بندوق اور اُس کے دوستوں سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ خواب سن کر عباس کے دوستوں نے عہد کیا کہ اس جنگ میں وہ بھی قلم کا ساتھ دیں گے اور اپنے وطن کو امن و آشتی کا گہوارہ بنائیں گے۔

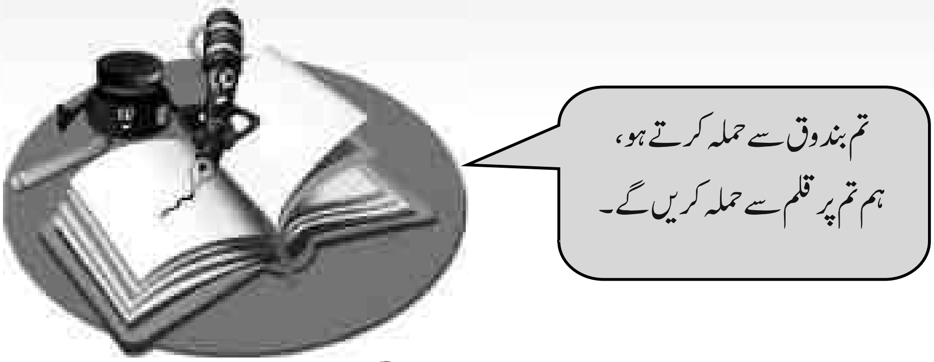

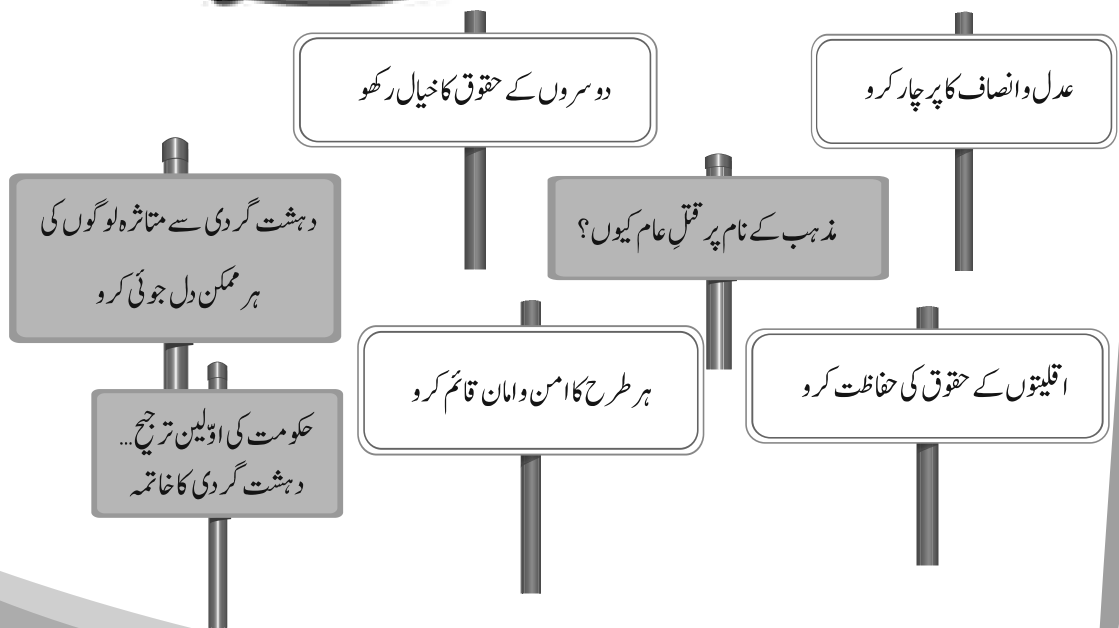

ایک قوم بن کر ابھرنا

دہشت گردی کی حوصلہ شکنی

ہر طرح کے اچھے مثبت رویّوں کو پروان چڑھانا

غربت کا خاتمہ

دہشت گردوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنا

اسلام...
امن و آشتی کا مذہب

دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنا اوّلین ترجیح

مذہبی آزادی اور رواداری

دہشت گردی کا پروپیگنڈا کرنے والوں کو بے نقاب کرنا

دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد

اسلام میں دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں

دہشت گردی سے نمٹنے والے اداروں کی ہر ممکن مدد کرنا

دوسروں کی رائے کا احترام کریں

مشق

1- سبق کے متن کو سامنے رکھ کر درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں:

i- علم کی طاقت سے کس طرح بندوق کو شکست دی جاسکتی ہے؟ ii- حکومت کی اوّلین ترجیح کیا ہے؟

iii- دہشت گردی سے معاشرتی زندگی کس طرح متاثر ہوتی ہے؟ iv- اسلام کیسے امن و آشتی کا مذہب ہے؟

v- مشکل حالات میں کیا رویّہ اپنانا چاہیے؟

2- مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں:

مناسب الفاظ

دہشت گردی
رویّوں
حقوق
مذہب

i- اقلیتوں کے ________ کی حفاظت کرو۔

ii- حکومت کی اوّلین ترجیح ________ کا خاتمہ ہے۔

iii- اسلام امن و آشتی کا ______ ہے۔

iv- ہمیں ہر طرح کے مثبت ________ کو پروان چڑھانا ہے۔

3- درج ذیل الفاظ کی مدد سے ایسے جملے بنائیں جو اُن کا مفہوم واضح کردیں:

i- بحث و تکرار: ....

ii- افراتفری : ....

iii- طرزِ عمل : ....

iv- مسائل : ....

v- حقیقت : ....

vi- تنقید : ....

4- نیچے دیے گئے کالم (ا) کو کالم (ب) سے اس طرح ملائیں کہ مفہوم واضح ہوجائے:

کالم (ا)	کالم (ب)
اقلیتوں کے حقوق کی	احترام کریں۔
حکومت کی اوّلین ترجیح	دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں۔
اسلام میں	دہشت گردی کا خاتمہ۔
دوسروں کی رائے کا	حفاظت کرو۔

بہادر بچّے

پاکستانی بچّے ہیں ہم ، امن سے اتنا پیار ہمیں
اپنے اندر کے دشمن سے لڑنا ہے اس بار ہمیں

دریا میں طغیانی ہے ، منجدھار میں کشتی ٹھہری ہے
لیکن ہم نے سوچ لیا ہے، جانا ہے اُس پار ہمیں

کلیاں دل کی کھِل جائیں گی، بادِصبا اِٹھلائے گی
فصلِ بہار ہے آنے والی ، دِکھتے ہیں آثار ہمیں

صحنِ چمن کی مٹی کو ہم اپنے خون سے سینچیں گے
اس کا اِک اِک صحرا آخر کرنا ہے گلزار ہمیں

ہم آنکھوں میں سپنے لے کر آگے بڑھتے جائیں گے
موت سے ہم کو ڈر نہیں لگتا، جینے سے ہے پیار ہمیں

منزل پر پہنچیں گے اِک دن، وہیں قیام کریں گے ہم
روک نہیں سکتی ہے ناصؔر کوئی بھی دیوار ہمیں

ناصؔر بشیر

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

(الف) پاکستانی بچوں کو کس چیز سے پیار ہے؟
(ب) پاکستانی بچوں نے کس سے لڑنے کا عزم کیا ہے؟
(ج) بچّے، صحنِ چمن کی مٹی کو کس چیز سے سینچیں گے؟
(د) پاکستانی بچوں کو کس شے سے ڈر نہیں لگتا؟

۲۔ نظم کا خُلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۳۔ نظم کے متن کو ذہن میں رکھ کر درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(الف) کشتی کہاں ٹھہری ہے؟

(i) دریا میں (ii) ساحل پر (iii) منجدھار میں (iv) لہروں پر

(ب) شاعر کے مطابق کون سا موسم آنے والا ہے؟

(i) بہار (ii) خزاں (iii) گرمی (iv) سردی

(ج) بچے صحرا کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟

(i) سبزہ زار (ii) گلستاں (iii) باغ (iv) گلزار

(د) ایک دن پاکستانی بچے قیام کریں گے:

(i) منزل پر (ii) راستے میں (iii) دشت میں (iv) گھر میں

۴۔ درج ذیل الفاظ پر اِعراب لگا کر تلفظ واضح کیجیے:

طغیانی، امن، گلزار، اٹھلائے، کشتی

۵۔ مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں:

(I) اپنے ______ کے دشمن سے لڑنا ہے اِس بار ہمیں
(ii) لیکن ہم نے ______ لیا ہے، جانا ہے اُس پار ہمیں
(iii) کلیاں دل کی ______ جائیں گی، بادِ صبا اِٹھلائے گی
(iv) صحنِ چمن کی مٹی کو ہم اپنے ______ سے سینچیں گے
(v) منزل پر پہنچیں گے اک دن، وہیں ______ کریں گے ہم

مناسب الفاظ

خون
اندر
قیام
سوچ
کِھل

۶۔ درج ذیل الفاظ کے معانی لغت میں تلاش کریں:

منجدھار، طغیانی، بادِ صبا، فصلِ بہار، سینچنا

☆☆☆

حصّہ نظم

میر انیسؔ
(۱۸۰۴ء-۱۸۷۴ء)

میر انیسؔ کا اصل نام سیّد ببر علی اور تخلص انیسؔ تھا۔ آپ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی اپنے والد میر خلیق سے پڑھی۔ دیگر مُروّجہ علوم فیض آباد کے ایک عالم میر نجف علی سے حاصل کیے۔ حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کے فن بھی سیکھے۔ میر انیسؔ موزوں طبع تھے۔ ان کے خاندان کے اکثر لوگ شعر کہتے تھے۔ فیض آباد کے جس ماحول میں میر انیسؔ پروان چڑھے، اس میں ہر طرف شاعری کا چرچا تھا۔ اس ادبی فضا نے میر انیسؔ کے طبعی رجحان کو جِلا بخشی اور وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے۔ کبھی کبھی والد کے ساتھ لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ آ گئے۔

میر انیسؔ ایک بلند پایہ مرثیہ نگار تھے۔ ان کے مَراثی میں سوز و گداز، کردار نگاری، جذبات نگاری اور منظر کشی کے بے مثال نمونے ملتے ہیں، جو اُن کی قادرالکلامی کی دلیل ہیں۔ انھوں نے واقعات و جذبات کے نہایت خوب صورت مُرقّعے پیش کیے ہیں۔ مرثیہ پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ سماں باندھ دیتے تھے۔ اردو کے معروف مُحقّق حافظ محمود شیرانی کے بقول: ''وہ اقلیمِ مرثیہ گوئی کے شہنشاہ تھے۔'' میر صاحب بہت پُر گو تھے۔ انھوں نے متعدد مرثیے لکھ ڈالے اور کوئی مرثیہ ڈیڑھ سو، دو سو بند سے کم کا نہ ہوگا، لیکن باوجود پُر گوئی کے، ان کے کلام میں کہیں ابتذال یا عامیانہ پن نہیں آنے پایا۔

یہ نظم ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جو ان کے تخیل، منظر نگاری اور لفظی تصویر کاری کی عمدہ مثال ہے۔

ان کے کُچھ مراثی انتخابِ مراثئ انیس کے نام سے مجلسِ ترقیِ ادب لاہور سے اور انیس کے مرثیے (دو جلدیں، مرتبہ: صالحہ عابد حسین)، رباعیاتِ انیس اور انیس کے سلام نامی کتب بھارت سے شائع ہو چکی ہیں۔

میدانِ کربلا میں گرمی کی شدّت

تدریسی مقاصد

۱۔ میر انیسؔ کے مقام و مرتبے اور شاعری کی صنفِ مرثیہ کا تعارف کرانا۔
۲۔ میدانِ کربلا میں گرمی کی شدّت اور جغرافیائی صورتِ حال سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔
۳۔ میر انیسؔ کی قادر الکلامی سے طلبہ و طالبات کو آگاہ کرنا۔
۴۔ مسدّس کی ہیئت سے متعارف کرانا۔
۵۔ نظم میں منظر نگاری کے عنصر سے آگاہ کرنا۔
۶۔ واقعۂ کربلا، اسلامی تاریخ کا نہایت دردناک اور اہم ترین واقعہ ہے۔ طلبہ کو واقعۂ کربلا کے حقائق اور خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت سے آگاہ کرنا۔
۷۔ طلبہ کو استعارہ اور مجازِ مرسل سے آگاہ کرنا۔

گرمی کا روزِ جنگ کی ، کیوں کر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ الحذر ، وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لُو ، وہ آفتاب کی حِدّت ، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سُوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حَبابوں کے ، تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک ، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فُرات کا

جھیلوں سے چارپائے نہ اٹھتے تھے تا بہ شام
مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھّر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ مومِ خام
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے ، سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اُترا تھا سائے کی چاہ سے

کوسوں کسی شجر میں نہ گُل تھے ، نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گُل نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ بار دار
گرمی یہ تھی کہ زِیست سے دل سب کے سرد تھے
پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقُوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہُو نہ مُنھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غُبار سے
گردُوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بُخار سے
گرمی سے مُضطرب تھا زمانہ زمین پر
بُھن جاتا تھا جو گِرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گُماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ ، مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

(کلیاتِ میر انیسؔ)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) میر انیسؔ نے پہلے بند میں زبان کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

(ب) دوسرے بند میں نہر کے ''لب'' سے کیا مراد ہے؟

(ج) شاعر کے بیان کے مطابق دریائے فُرات کے پانی پر دھوپ کا کیا اثر ہوا؟

(د) شاعری میں میر انیسؔ کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

(ہ) ہیئت کے اعتبار سے اس نظم (میدانِ کربلا میں گرمی کی شدّت) کو کیا کہیں گے؟

۲۔ نظم ''میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت'' کا متن مدِّنظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) ''میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟

(i) مرزا دبیر (ii) میر انیس

(iii) مولوی میر حسن (iv) میر خلیق

(ب) نظم ''میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت'' صِنفِ سخن کے لحاظ سے کیا ہے؟

(i) آزاد نظم (ii) قصیدہ

(iii) شہرِ آشوب (iv) مرثیہ

(ج) شاعر گرمی کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے لرزاں ہے کہ:

(i) زبان مثلِ شمع نہ جل اٹھے (ii) خود اس شدت کا شکار نہ ہو جائے

(iii) بیان سے قاصر ہے (iv) مبالغہ نہ ہو جائے

(د) رن کی زمیں سرخ تھی اور آسماں تھا:

(i) سبز (ii) نیلا

(iii) زرد (iv) سرخ

(ہ) زمین پر خلقِ خدا کس چیز کو ترس رہی تھی؟

(i) پانی کو (ii) آبِ خنک کو

(iii) ٹھنڈی ہوا کو (iv) بادل کے سائے کو

(و) دن کے مثالِ شب سیاہ ہونے کی وجہ کیا تھی؟

(i) آفتاب کی حدت (ii) دھوپ

(iii) تپش (iv) لُو

(ز) نہنگوں پر گرمی کا کیا اثر تھا؟

(i) پسینے چھوٹ رہے تھے (ii) بے ہوش تھے

(iii) جان لبوں پر تھی (iv) ہانپ رہے تھے

۳۔ ''میدانِ کربلا میں گرمی کی شدّت''میں جان داروں کا ذکر آیا ہے، ان کے ناموں کی فہرست تیار کیجیے۔

۴۔ درجِ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیے:

آفتاب، مسکن، شجر، آہُو، گرداب، ماہی

۵۔ نظم کے آخری بند کی تشریح کیجیے۔

۶۔ قوسین میں دیے گئے الفاظ سے درست لفظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) پتھر پگھل کر .... ہو گئے تھے۔ (راکھ، خاک، موم)

(ب) مُسدّس کا ہر بند .... مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ (دو، تین، چھے)

(ج) گرمی کی شدت سے پتّوں کا رنگ .... ہو گیا۔ (زرد، سیاہ، سُرخ)

(د) شاعر نے درخت کے جلنے کو .... سے تشبیہ دی ہے۔ (کوئلے، لکڑی، چنار)

(ہ) .... سے سورج کا چہرہ دھندلا گیا تھا۔ (غُبار، بُخار، گرمی)

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ اور تراکیب کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

مثلِ شمع، الاماں، تاب وتب، چشمۂ حیات، برگ وبار، مدقوق، مضطرب، شررفشاں، مُکدّر، سرگرمیاں

اِستعارہ:

اِستعارہ کے لفظی معنی ادھار لینا کے ہیں۔علمِ بیان کی اصطلاح میں جب ہم کسی چیز کے معنی مستعار لے کر دوسری چیز کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ جیسے:

ماں نے کہا''میرا چاند سکول سے آ گیا ہے۔''

باپ نے کہا''میرا بیٹا رستم ہے۔''

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے۔

ان جملوں میں بچے کو چاند، بیٹے کو رستم اور بہادر انسان کو شیر کہا گیا ہے یعنی چاند، رستم اور شیر کے الفاظ مستعار لے کر بچے، بیٹے اور بہادر انسان کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

ارکانِ اِستعارہ:

۱۔مستعارلہٗ: جس کے لیے لفظ مستعار لیا جائے۔اوپر کی مثالوں میں بچہ، بیٹا اور بہادر انسان (شاعر کا اشارہ حضرت عباسؓ بن علیؑ کی طرف ہے) مستعارلہٗ ہیں۔

۲۔مستعار مِنہ: جس سے لفظ ادھار لیا جائے۔ یہاں چاند، رستم اور شیر مستعار منہ ہیں۔

۳۔وجہ جامع: مستعارلہٗ اور مستعار مِنہ کے مابین مشترک صفت کو وجہ جامع کہا جاتا ہے۔اوپر کی مثالوں میں خوب صورتی اور بہادری وجہ جامع ہیں۔مستعارلہٗ اور مستعار مِنہ میں تشبیہ کا تعلّق ہوتا ہے۔

استعارے میں مستعارلہٗ حقیقی نہیں، بلکہ مجازی معنی دیتا ہے۔

آپ کسی ایک نظم سے استعارے تلاش کر کے لکھیے۔

مجازِ مرسل:

اگر کسی لفظ کو حقیقی کی بجائے مجازی (غیر حقیقی) معنوں میں استعمال کیا جائے اور دونوں میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلّق ہو تو وہ مجازِ مرسل کہلاتا ہے۔اس کی کئی صورتیں ہیں:

(الف) انسان کی زندگی چار دن کی ہے۔

اس میں جزو بول کر کُل مراد لی گئی ہے۔

(ب) حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض کی تشخیص کر دی۔

یہاں کُل بول کر جُزو مراد لی گئی ہے۔(نبض پر ہاتھ نہیں، تین انگلیاں رکھی جاتی ہیں)

(ج) برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے

یہاں سبب (ابر) بول کر مسبّب (پانی) مراد لیا گیا ہے۔

(د) مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

یہاں آلہ (زبان) بول کر وہ چیز (بولی) مراد لی گئی ہے جس کے لیے یہ آلہ بنایا گیا ہے۔

۸۔ اس نظم میں سے تشبیہ، اِستعارہ اور مجازِ مرسل الگ کر کے لکھیں۔

۹۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

روز، آفتاب، کانٹا، حیات، سیاہ، سبزہ زار، شررفشاں

۱۰۔ نظم کو غور سے پڑھیں اور ہر بند کے قافیے لکھیں:

(الف)	بیاں	زباں	الاماں	آسماں
(ب)	تب	......	......	......
(ج)	شام	......	......	......
(د)	بار	......	......	......
(ہ)	گماں	......	......	......

سرگرمیاں

۱۔ میر انیسؔ کی نظم کی خوبیاں کاپی میں نوٹ کریں۔

۲۔ اس نظم کی روشنی میں گرمی کی شدّت پر مختصر مضمون لکھ کر استاد صاحب کو دکھائیں۔

۳۔ میر انیسؔ نے جو تشبیہات استعمال کی ہیں، ان کی فہرست تیار کریں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ مرثیہ نگاری کا مختصر تعارف کراتے ہوئے طلبہ کو بتایا جائے کہ اس کی ابتدا عربوں نے کی۔

۲۔ طلبہ پر واضح کیا جائے کہ میر انیسؔ کے ہاں مبالغہ آرائی موجود ہے۔

۳۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مسدّس نظم میں ہر بند چھے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۴۔ مولانا حالیؔ کی مسدّس سے ایک بند پڑھ کر طلبہ کو سنایا جائے۔

۵۔ مرثیے کی وضاحت کرتے ہوئے مختصراً قصیدے کا ذکر کر کے فرق واضح کیا جائے۔

۶۔ طلبہ کو میر انیسؔ ہی کا ایک مرثیہ ''میدانِ کربلا میں صبح کا منظر'' بھی پڑھ کر سنایا جائے۔

علامہ محمد اقبالؒ

(۹۔نومبر ۱۸۷۷ء۔۲۱۔اپریل ۱۹۳۸ء)

علامہ محمد اقبالؒ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔انٹر سکاچ مشن کالج سے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے۔لندن سے بار ایٹ لا کرنے کے بعد جرمنی سے پی ایچ ڈی کی۔ واپس آ کر وکالت کرتے رہے۔۱۹۳۸ء میں فوت ہوئے۔لاہور میں شاہی مسجد کے باہر آسودۂ خاک ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ ہمارے قومی اور ملّی رہنما ہیں۔اردو اور فارسی زبان کے عظیم شاعر ہونے کے علاوہ ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ وہ بیسویں صدی میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے ایک بڑے علم بردار تھے۔انھوں نے اپنے فکر و فن سے مشرق و مغرب کے ادیبوں،شاعروں اور عام لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ان کی نظم و نثر کے تراجم تیس زبانوں میں ہو چکے ہیں۔اردو اور فارسی کلام کے علاوہ ان کا نثری سرمایہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اقبالؒ کی تصانیف میں علم الاقتصاد، مکاتیبِ اقبال، انوارِ اقبال، خطباتِ اقبال، فارسی شعری مجموعے اسرار و رموز، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق،اور اردو مجموعہ ہائے کلام میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز (اس میں فارسی کلام بھی شامل ہے) متعدد مرتبہ شائع ہو چکے ہیں۔اقبالؒ کے خطوط کے مختلف مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ان میں کلیاتِ مکاتیبِ اقبال جو بھارت سے پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہے،زیادہ اہم ہے۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی)

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو اقبال کی شاعری کے فنی محاسن اور عظمت سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ میں جذبۂ حُبُّ الوطنی پیدا کرنا۔
۳۔ طلبہ کو ایک مثالی مسلمان لڑکی کے کردار سے آگاہ کرنا۔

فاطمہ! تُو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حُورِ صحرائی ! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر!
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر!
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!
اپنے صحرا میں بہت آہُو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ، ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جن کی تابانی میں اندازِ کُہن بھی، نَو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

(کلیاتِ اقبال اُردو)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے:

(الف) ''برسے ہوئے بادل'' سے کون مراد ہے؟

(ب) شاعر نے نظم کے پہلے شعر میں مرحومہ کو کیسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے؟

(ج) فاطمہ کو ''راکھ میں دبی ہوئی چنگاری'' کیوں کہا گیا ہے؟
(د) نظم میں ''تازہ انجم کے ظہور'' کا مفہوم واضح کریں۔
(ہ) آنکھ کی شبنم افشانی سے کیا مراد ہے؟

۲۔ نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ متن کو ذہن میں رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیے:

(الف) نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟
(i) علامہ محمد اقبالؒ (ii) حفیظ جالندھری (iii) ظفر علی خاں (iv) احسان دانش

(ب) یہ نظم کس مجموعۂ کلام سے لی گئی ہے؟
(i) بانگِ درا (ii) بالِ جبریل (iii) ضربِ کلیم (iv) ارمغانِ حجاز

(ج) فاطمہ بوقتِ شہادت کس فرض کی ادائیگی میں مصروف تھی؟
(i) پانی پلانے میں (ii) مرہم پٹی کرنے میں (iii) مریضوں کی دیکھ بھال کرنے میں (iv) نماز پڑھنے میں

(د) شاعر نے فاطمہ کو حور کہا ہے:
(i) صحرائی (ii) ارضی (iii) آسمانی (iv) جنت

(ہ) ''اپنی خاکستر'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
(i) سرزمینِ طرابلس (ii) سرزمینِ پاک و ہند (iii) اُمتِ مُسلِمہ (iv) سرزمینِ سیالکوٹ

۴۔ درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں:
سقائی، خاکستر، نشاط، جسارت، ذرہ، تربت، سپر

۵۔ دیدۂ انساں سے شاعر کی مراد کیا ہے؟

۶۔ نظم کا متن ذہن میں رکھ کر مصرعے مکمل کریں:

(الف) ذرہ ذرہ تیری_ _ _ _ _ _ _ _ _ خاک کا معصوم ہے
(ب) یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے_ _ _ _ _ _ _ _ _وسپر
(ج) ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت_ _ _ _ _ _ _ _ _!
(د) رقص تیری خاک کا کتنا_ _ _ _ _ _ _ _ _ ہے
(ہ) دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی_ _ _ _ _ _ _ _ _

۷۔ درجِ ذیل مرکّبات کا مختصر مفہوم لکھیں:

مُشتِ خاک، بےتیغ وسپر، شبنم افشاں، نغمۂ عشرت، نالۂ ماتم، دیدۂ انساں

۸۔ متن کو ذہن میں رکھ کر کالم (الف) کا ربط کالم (ب) کے الفاظ سے کریں:

کالم (الف)	کالم (ب)
تیغ	خزاں
حُور	خاموش
گلستاں	سپر
فضا	صحرائی
تُربت	شہادت
شوق	آسماں

سرگرمیاں

۱۔ بانگِ درا میں ''بلالؓ'' کے عنوان سے دو نظمیں ہیں، ان کا مطالعہ کیا جائے۔

۲۔ چند طلبہ اس نظم کو مل کر خوش الحانی سے پڑھیں۔

۳۔ نظم پڑھنے کے بعد اپنے اپنے تاثّرات کاپیوں پر قلم بند کریں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو علامہ محمد اقبالؒ کی طویل نظموں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے بارے میں بتائیں۔

۲۔ طلبہ پر ملّت اور قوم کا فرق واضح کریں۔

۳۔ کسی خوش آواز طالب علم سے ''خودی کا سِرِّ نہاں......'' پڑھوائیں۔

۴۔ طلبہ کو خلافتِ عثمانیہ، جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔

☆☆☆

جوشؔ ملیح آبادی
(۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء)

جوشؔ ملیح آبادی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پورا نام شبیر حسن خاں اور جوشؔ تخلص تھا۔ قلمی نام جوشؔ ملیح آبادی اختیار کیا۔ ان کے خاندان میں علم و ادب کی روایت موجود تھی۔ ان کے دادا بھی شاعر تھے۔ جوشؔ نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ ان کا گھرانا، مالی طور پر آسُودہ تھا۔ سینٹ پیٹرک کالج آگرہ اور علی گڑھ کالج میں زیرِ تعلیم رہے، مگر سینیئر کیمبرج سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اوائل میں رابندر ناتھ ٹیگور سے متاثر تھے، اس لیے ان کی شاعری میں ٹیگور کے اثرات ملتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن جا کر عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے وابستہ ہوئے اور تقریباً تیرہ سال تک وہاں ملازمت کی۔ بعد ازاں متعدد ادبی رسالوں کے مدیر رہے۔ جوشؔ نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان آ گئے اور ترقیِ اُردو بورڈ کراچی سے منسلک ہوئے۔ عمر کا آخری زمانہ اسلام آباد میں گزارا۔

جوشؔ زبان و بیان پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ الفاظ کے در و بست پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ رومانوی شاعری ان کا امتیاز ہے۔ انھیں ''شاعرِ انقلاب'' بھی کہا جاتا ہے۔ اردو کی مقبول ترین صِنفِ سخن غزل سے ان کی دل چسپی نہ تھی، بلکہ ان کا شمار غزل کے مخالفین میں ہوتا ہے۔ وہ نظم کے شاعر تھے۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام روحِ ادب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ دیگر مجموعوں میں شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، سنبل وسلاسل، جذباتِ فطرت، سرود و خروش، شاعر کی راتیں وغیرہ شامل ہیں۔ جوش کی خودنوشت یادوں کی برات ان کے مخصوص اسلوبِ نثر کا نمونہ ہے۔

کسان

تدریسی مقاصد

۱۔ کسان کی محنت کی تحسین کرنا۔
۲۔ نظم کے ذریعے سے طلبہ میں حبّ الوطنی اور محنت کا جذبہ پیدا کرنا۔
۳۔ نظم کے آہنگ سے لُطف اندوز ہونا۔
۴۔ طلبہ کو دیہی زندگی اور ملکی معیشت میں کسان کی اہمیت کا احساس دلانا۔
۵۔ جوشؔ ملیح آبادی کی نظم نگاری کے اسلوب اور شکوہِ لفظی سے متعارف کرانا۔

جُھٹ پٹے کا نرم رَو دریا ، شَفَق کا اِضطِراب
کھیتیاں ، میدان ، خاموشی ، غروبِ آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان ، یعنی کاشت کار
اِرتقا کا پیشوا ، تہذیب کا پروردِگار

جلوۂ قدرت کا شاہد ، حُسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل ، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بُو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

سر نِگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بُوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کَس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہر یار

دھوپ کے جُھلسے ہوئے رُخ پر مَشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے مُنھ، گھر کی جانب ہے رواں

(شعلہ و شبنم)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے:

(الف) نظم کے دوسرے شعر میں شاعر نے کن الفاظ میں کسان کی تحسین کی ہے؟

(ب) ''جلوۂ قدرت کا شاہد'' سے کون مراد ہے؟

(ج) نبضِ خاک پہ انگلیاں رہنے کا کیا مطلب ہے؟

(د) شاعر نے کسان کے گھر لوٹنے کی جو تصویر کشی کی ہے، اسے دو سطروں میں لکھیے۔

(ہ) شاعر نے کسے ارتقا کا پیشوا کہا ہے؟

(و) کون سی قوتیں کسان سے سرنگوں رہتی ہیں؟

(ز) کھیت سے مُنھ پھیر کر کسان کہاں جاتا ہے؟

(ح) نظم کے آخری شعر میں شاعر نے کن پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے؟

۲۔ نظم ''کسان'' کا متن مدِّنظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) نظم کا ابتدائی منظر ہے:

(i) شام کا (ii) صبح کا

(iii) جُھٹ پٹے کا (iv) رات کا

(ب) کسان کی انگلیاں دن کے وقت رہتی ہیں:

(i) ہل کی ہتھی پر (ii) حُقّے کی نَے پر

(iii) خاک کی نبض پر (iv) بانسری پر

(ج) کسان قدرت کے جلوے کا ہے:

(i) نبّاض (ii) گواہ

(iii) مدّاح (iv) شاہد

(د) کسان کھیت سے رخ پھیر کر کہاں جاتا ہے؟

(i) گھر میں (ii) ویرانے میں

(iii) منڈیر کی طرف (iv) گاؤں میں

(ہ) نظم ''کسان'' کس شاعر کی تخلیق ہے؟

(i) جوش ملیح آبادی (ii) جمیل الدین عالی

(iii) میر انیس (iv) دلاور فگار

(و) یہ نظم جوش کے کس مجموعہ کلام سے لی گئی ہے؟

(i) حرف و حکایت (ii) شعلہ و شبنم

(iii) جذباتِ فطرت (iv) سنبل و سلاسل

(ز) شاعر نے تہذیب کا پروردگار کسے کہا ہے؟

(i) عالم (ii) مزدور

(iii) کسان (iv) معلّم

۳۔ نظم ''کسان'' کا متن ذہن میں رکھ کر، درست الفاظ کے ذریعے سے مصرعے مکمل کریں:

(الف) جلوۂ قدرت کا ....حسنِ فطرت کا گواہ

(ب) دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ ....پر

(ج) جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر............کی

(د) جس کے کس بل پر اکڑتا ہے ....شہریار

(ہ) دھوپ کے جھلسے ہوئے............پر مشقت کے نشاں

۴۔ جوش نے کسان کی جو صفات بیان کی ہیں، ان کی فہرست بنائیے۔

۵۔ درجِ ذیل فہرست میں سے مذکر مؤنث الگ الگ کیجیے:

نظم، شفق، میدان، سماں، فاتح، نسیم، فطرت، تہذیب، دھوپ، فلک

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

جُھٹ پٹا، اِضطراب، اِرتقا، سرِنگوں، تخریب، مشقّت

۷۔ درج ذیل الفاظ کے جوڑوں میں صوتی مشابہت ہے، لیکن ہر جوڑے کے لفظ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔ ہر لفظ کے الگ الگ معانی لکھیں:

اَلَم، عَلَم۔ بعض، باز۔ پارہ، پارا۔ روزہ، روضہ۔ قاش، کاش

سرگرمیاں

۱۔ جوشؔ کی ایک اور مختصر سی نظم ڈھونڈ کر پڑھیں اور کاپی پر نوٹ کریں۔

۲۔ ''کسان کی مشقّت بھری زندگی'' کے عنوان سے طلبہ میں مضمون نویسی کا مقابلہ کرایا جائے۔

۳۔ طلبہ درست آہنگ میں یہ نظم پڑھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ نظم کے حوالے سے طلبہ پر محنت کی اہمیت واضح کی جائے۔ حدیث شریف (الکاسب حبیب اللّٰہ) کا حوالہ دیا جائے۔

۲۔ کسان کے موضوع پر کسی اور شاعر کی نظم طلبہ کو سنائی جائے یا مزدور کے موضوع پر احسان دانشؔ یا کسی اور شاعر کی نظم سنا کر محنت کی عظمت واضح کی جائے۔

۳۔ جوشؔ کی نظم گوئی کی خوبیوں اور آہنگ سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

۴۔ طلبہ پر واضح کیا جائے کہ حالات اور وقت کے ساتھ جو معاشرتی تبدیلیاں آتی ہیں، ان سے شہر اور دیہات دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ اب مشینی کاشت کاری بڑھ گئی ہے لیکن دور دراز کے دیہات میں اب بھی ایسی تصویریں مل جاتی ہیں۔

۵۔ طلبہ سے یہ نظم ترنّم سے اور تحت اللفظ پڑھوائی جائے۔

جمیل الدین عالؔی

(۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء)

جمیل الدین عالی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ریاست لوہارو کے نواب علاءُالدین علائی کے پوتے ہیں۔ (علائی مرزا غالبؔ کے دوست اور شاگرد تھے) ۱۹۵۱ء میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے سِول سروس میں شامل ہو گئے۔ صدرِ پاکستان محمد ایوب خاں کے افسر بکارِ خاص بھی رہے۔ پاکستان رائٹرز گِلڈ کا قیام اِنھی کی کاوشوں سے عمل میں آیا۔ ۱۹۶۷ء سے روزنامہ جـــنگ سے بطور کالم نگار وابستہ ہیں۔ متعدد ادبی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔

جمیل الدین عالی کا شمار بسیار نویس ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سفرنامے، غزلیں، دوہے، گیت اور ملی نغمے لکھے۔ ان کے ملی نغمے مختلف نصابات کا حصہ رہے ہیں۔

ان کی معروف تصانیف میں غـزلیں، دوہے، گیت، جیوے جیوے پاکستان، دنیا مرے آگے، تماشا مرے آگے، صدا کر چلے اور دعا کر چلے شامل ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں ان کے ملّی ترانوں کو خاصی شہرت ملی۔ یہ ملّی نغمہ بھی انھی مقبولِ عام ترانوں میں شامل ہے۔

جیوے جیوے پاکستان

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ میں وطن سے محبت کے جذبے کو تحریک دینا۔
۲۔ ترانے کے ذریعے سے طلبہ میں جوش و جذبہ پیدا کرنا۔
۳۔ جمیل الدین عالیؔ کے فن، قومی نغموں اور ملّی ترانوں سے طلبہ کو واقفیت دلانا۔
۴۔ طلبہ کو قومی نغمے کے مفہوم سے واقفیت دلانا اور ان کی اہمیت واضح کرنا۔

جیوے جیوے --- جیوے پاکستان
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان
مہکی مہکی روشن روشن پیاری پیاری نیاری
رنگ برنگے پھولوں سے اک سجی ہوئی پھلواری
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان
من پنچھی جب پنکھ ہلائے کیا کیا سُر بکھرائے
سُننے والے سنیں تو ان میں ایک ہی دُھن لہرائے
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان
بچھڑے ہوؤں کو بکھرے ہوؤں کو اک مرکز پر لایا
کتنے ستاروں کے جُھرمٹ میں سورج بن کر آیا
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان
سب محنت کش گلے ملے اور اُبھرا اک پیغام
اس پیغام کو سمجھو یہ ہے قدرت کا انعام
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان

جھیل گئے دکھ جھیلنے والے، اب ہے کام ہمارا
ایک رہیں گے، ایک رہے گا، ایک ہے نام ہمارا
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان
جیوے جیوے --- جیوے پاکستان
پاکستان پاکستان --- جیوے پاکستان

(جیوے جیوے پاکستان)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے جواب لکھیے:

(الف) اس نغمے کے پہلے بند میں نیاری، پھلواری قافیے ہیں۔اس نظم کے بقیہ قوافی ترتیب سے لکھیں۔

(ب) جھیل گئے دکھ جھیلنے والے،اب ہے کام ہمارا

اس مصرعے کا مفہوم بیان کیجیے۔

۲۔ نظم ''جیوے جیوے پاکستان'' کا متن ذہن میں رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) شاعر نے پاکستان کو رنگ برنگے پھولوں سے سجی کہا ہے:

(i) ٹوکری (ii) پھلواری
(iii) دلکش کھیتی (iv) نگری

(ب) پاکستان نے بچھڑے اور بکھرے ہوؤں کو:

(i) متحد کیا (ii) ایک مرکز پہ لا کھڑا کیا
(iii) شادکام کیا (iv) گھر دیا

(ج) پاکستان ستاروں کے جھرمٹ میں ہے:

(i) سورج (ii) چاند
(iii) مرکزہ (iv) روشن ستارہ

(د) سب محنت کش:

(i) کام میں لگ گئے (ii) متحد ہو گئے

(iii) گلے ملے (iv) تعمیرِ وطن پہ لگ گئے

(ہ) جھیل گئے دکھ جھیلنے والے سے مراد ہے:

(i) محنت کش (ii) مزدور

(iii) کسان (iv) پاکستان بنانے والے

(و) ''جیوے جیوے پاکستان'' کا تخلیق کار ہے:

(i) جمیل الدین عالیؔ (ii) جوشؔ ملیح آبادی

(iii) حفیظؔ جالندھری (iv) احسان دانشؔ

۳۔ درجِ ذیل مرکبات کا مفہوم تفصیل سے لکھیے:

من پنچھی، ستاروں کے جھرمٹ، اک پیغام، دکھ جھیلنے والے

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ ان کے مفہوم کی وضاحت ہو جائے:

پھلواری، پنچھی، دُھن، جھرمٹ، پیغام، قدرت، جھیلنا، مرکز

۵۔ اِس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

روشن، پیاری، جیوے، بکھرے، بچھڑے، اُبھرا، انعام

۷۔ نظم ''جیوے جیوے پاکستان'' کے مطابق درست لفظ لگا کر مصرعے مکمل کریں:

(الف) مہکی مہکی روشن روشن، پیاری پیاری ______

(ب) من ______ جب پنکھ ہلائے کیا کیا سُر بکھرائے

(ج) اس پیغام کو سمجھو یہ ہے قدرت کا ______

(د) سننے والے سنیں تو ان میں ایک ہی ______ لہرائے

(ہ) ایک رہیں گے، ایک رہے گا، ایک ہے ______ ہمارا

سرگرمیاں

۱۔ طلبہ اس مِلّی نغمے کو زبانی یاد کریں۔

۲۔ چند طلبہ مِل کر کورس کی شکل میں یہ مِلّی نغمہ گائیں۔

۳۔ جماعت میں مِلّی نغمے پڑھنے کا مقابلہ منعقد کرایا جائے۔

۴۔ اس نظم کو ذہن میں رکھتے ہوئے ''حبِّ وطن'' کے موضوع پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

۵۔ اپنا کوئی پسندیدہ مِلّی نغمہ اپنی ڈائری میں درج کریں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ پر قومی اور مِلّی نغموں کی اہمیت واضح کیجیے۔

۲۔ جمیل الدین عالی کی ادبی خدمات سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

۳۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ قومی اور مِلّی نغمے اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ کڑے وقت میں ان کے ذریعے سے ملک کا دفاع کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

۴۔ طلبہ کو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ریڈیو سے نشر ہونے والے مِلّی اور قومی نغموں کے اثرات سے آگاہ کریں۔

۵۔ چند اور مِلّی نغمے مثلاً ....مَیں بھی پاکستان ہوں............ وغیرہ جماعت کے کمرے میں طلبہ سے کورس کی شکل میں سنے جائیں اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

دلاور فگاؔر
(۱۹۲۹ء-۱۹۹۸ء)

دلاور فگاؔر کا اصل نام دلاور حسین، تخلص پہلے شباؔب تھا پھر فگاؔر اختیار کیا۔ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بدایوں ہی میں حاصل کی۔ ایم اے اردو کا امتحان آگرہ یونی ورسٹی سے اوّل بدرجہ اوّل پاس کیا۔ اسی یونی ورسٹی سے ایم اے معاشیات کا امتحان بھی پاس کیا۔

دلاور فگاؔر نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ معروف شاعر شکیل بدایونی کے مشورے کے بعد شگفتہ شاعری کی طرف مائل ہوگئے اور اس شعبے میں کمال حاصل کیا۔ بطور مزاحیہ شاعر انھیں بھارت میں بھی شہرت حاصل تھی۔ ۱۹۶۹ء میں ہجرت کر کے کراچی منتقل ہوگئے۔ یہاں بھی واقعاتی مزاحیہ شاعری میں انھیں قبولِ عام ہوا۔

دلاور فگار کی حسِ مزاح تیز ہے۔ شعر گوئی کی ہُنر مندی اور طنز کا مخصوص انداز ان کی شاعری کی شہرت اور مقبولیت کا بڑا سبب ہے۔

ان کے شعری مجموعوں میں حادثے (غزلیات)، ستم ظریفیاں، شامتِ اعمال، آداب عرض، انگلیاں فگار اپنی، از سرِ نو، مَطلَع عرض ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے اور فی سبیل اللّٰہ اہم ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کراچی کے اخبارات نوائے وقت، جسارت اور مساوات میں منظوم کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ ان کا تمام مزاحیہ کلام کلیاتِ دلاور فگار کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں کراچی میں انتقال کیا۔

اُونٹ کی شادی

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کی حسِ مزاح کی تسکین کا اہتمام کرنا۔
۲۔ اچھوتے موضوع سے مزاح کے پہلو کیسے نکالے جاتے ہیں؟ طلبہ کو اس سے روشناس کرانا۔
۳۔ مزاحیہ ادب میں مزاحیہ شاعری کے مفہوم ومعنی اور روایت سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔

نیا یہ آج کے پرچے نے گُل کِھلایا ہے
کہ سہرا باندھ کے اِک اونٹ بلبلایا ہے
شُتر کے گھر میں پیامِ بہار ہے سہرا
کبھی کبھی تو بڑا بے مہار ہے سہرا
مرے بنَے کو مبارک یہ خُوش گوار گھڑی
کہ سر کا درد بڑھا ناک میں نکیل پڑی
سمجھ لیا تھا جسے جانور سواری کا
وہ اونٹ بوجھ اٹھائے گا ذِمّہ داری کا
میاں شُتر کو مبارک یہ رِشتۂ شادی
اسی کو کہتے ہیں اُردو میں قیدِ آزادی
میاں شُتر نئی گاڑی لیے سفر کو چلے
مجھے خوشی ہے کہ تم آ گئے پہاڑ تلے
مجھے بیاہ کی تصویر بھیج دیں جھٹ پٹ
یہ دیکھنا ہے کہ بیٹھے ہیں آپ کس کروٹ

☆☆☆☆

(کلیاتِ دلاور فگاؔر)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھیے:

(الف) نظم میں شاعر نے ''نیا گل کھلانے'' کا ذکر کر کے کس طرف اشارہ کیا ہے؟

(ب) نکیل پڑنے سے شاعر کی مراد کیا ہے؟

(ج) شاعر نے سر کا درد بڑھنے کی وجہ کیا بتائی ہے؟

(د) نظم کے آخری شعر میں شاعر نے کس ضرب المثل کی طرف اشارہ کیا ہے؟

۲۔ نظم ''اونٹ کی شادی'' کے متن کو مدِّنظر رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) نظم ''اونٹ کی شادی'' شاعر نے لکھی ہے:

(i) سید ضمیر جعفری (ii) سید محمد جعفری

(iii) دلاور فگار (iv) محمود سرحدی

(ب) نظم کے پہلے مصرعے میں آج کے پرچے سے مراد ہے:

(i) آج کا اخبار (ii) رسالہ

(iii) امتحانی پرچہ (iv) پولیس کا پرچہ (FIR)

(ج) کھلانا کا مطلب ہے:

(i) پھول کھلنا (ii) عجیب و غریب کام کرنا

(iii) نئی بات کہنا (iv) انکشاف کرنا

(د) شُتر کے گھر میں کیا آیا ہے؟

(i) ہوا کا جھونکا (ii) خوش کُن پیغام

(iii) پیامِ بہار (iv) ایک اور اونٹ

(ہ) اردو میں قیدِ آزادی کسے کہتے ہیں؟

(i) قید بامشقّت کو (ii) شادی خانہ آبادی کو

(iii) جرم کی سزا کو (iv) آزادی کے خاتمے کو

۳۔ نظم کا متن ذہن میں رکھ کے حسبِ ذیل مصرعے مکمل کریں:

(الف) کہ سہرا باندھ کے ایک اونٹ .... ہے

(ب) کہ سر کا درد بڑھا ناک میں .... پڑی

(ج) اسی کو کہتے ہیں اردو میں ....

(د) مجھے خوشی ہے کہ تم آ گئے .... تلے

(ہ) مجھے بیاہ کی تصویر بھیج دیں ....

۴۔ درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں:

بلبلانا، خوش گوار، نکیل، شتر، کروٹ

۵۔ نظم کے قوافی ترتیب سے لکھیں۔

۶۔ درجِ ذیل کا مفہوم واضح کیجیے:

گُل کھلانا، بے مہار، نکیل پڑنا، قیدِ آزادی، کسی کروٹ بیٹھنا

۷۔ نظم کا خلاصہ تحریر کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ لائبریری سے دلاور فگار کی کوئی ایک کتاب لے کر مطالعہ کریں اور اپنی پسند کے اشعار اپنی کاپی میں درج کریں۔

۲۔ ہر طالب علم اپنی مرضی سے کوئی مزاحیہ تحریر یا اشعار لکھے اور ساتھیوں کو سنائے۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ پر طنز اور مزاح کا فرق واضح کیجیے۔

۲۔ دلاور فگار کے مزاح کی فنی خوبیاں طلبہ کو بتائیں۔

۳۔ طلبہ پر واضح کیا جائے کہ فطرت اور معمول سے ہٹی ہوئی صورتِ حال ہماری ہنسی کو تحریک دیتی ہے۔ یہ صورتِ حال مزاح کہلاتی ہے۔

۴۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مزاح نگار کیسے (صورتِ واقعہ اور الفاظ وغیرہ سے) مزاح پیدا کرتا ہے۔

۵۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مزاح نگاری الگ سے صِنفِ ادب نہیں بلکہ کسی بھی صِنفِ میں مزاح لکھا جاسکتا ہے۔

۶۔ طلبہ کو چند دیگر مزاح نگار شعرا (سیّد محمد جعفری، محمود سرحدی، سیّد ضمیر جعفری، انور مسعود، نیاز سواتی وغیرہ) کا کلام سنایا جائے۔

مرزا محمود سرحدی

(۱۹۱۳ء-۱۹۶۷ء)

مرزا محمود سرحدی مردان میں پیدا ہوئے۔ اصل نام عبداللطیف تھا۔ تعلیم کا سلسلہ مردان ہی میں مکمّل ہوا۔ عملی زندگی کا آغاز فوج کی ملازمت سے کیا مگر اسے غیر موزوں پا کر ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد شعبۂ تعلیم سے منسلک ہوگئے اور گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعدازاں علامہ مشرقی ہائی سکول پشاور کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ زندگی کے بعض مرحلوں پر انھیں کلرکی اور مزدوری بھی کرنی پڑی۔ انھوں نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ آخری عمر میں دمے کا شکار رہے۔ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔

محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی صورتِ حال کی مضحک تصویریں نہایت مہارت کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں، جن میں طنز کا عنصر نہایت گہرا ہوتا ہے۔ عوامی اور معاشرتی مسائل پر ان کا قلم خوب رواں ہوتا ہے۔

پشاور کے جریدے سنگِ میل کے ذریعے سے وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ ان کی زندگی میں ان کا شعری مجموعہ سنگینے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ اندیشۂ شہر بعداز مرگ ۱۹۷۰ء میں چھپا۔ کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔

مال گودام روڈ

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو محمود سرحدی کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری سے واقف کرانا۔
۲۔ محمود سرحدی کی شاعری کی شعری خوبیاں نمایاں کرنا۔
۳۔ طلبہ پر موجودہ معاشرے میں پائی جانے والی چند خامیاں واضح کرنا۔

یوں تو میرے شہر میں سڑکیں کئی ہیں لازوال
لیکن اک ایسی سڑک بھی ہے نہیں جس کی مثال

اس کی چھاتی پر کئی ٹانگے اُلٹ کر رہ گئے
سیکڑوں گھوڑوں کا اس پر ہو چکا ہے انتقال

آس پاس اس کے جو بستے ہیں نہ ان کی پوچھیے
جس قدر ویراں ہے یہ ، ہیں اس قدر وہ خستہ حال

رونقیں ہی رونقیں ہیں جس طرف بھی دیکھیے
چیخنے لگتے ہیں اس پر شام ہوتے ہی شِغال

لاریاں پٹرول کی دیکھو گے اس پر صبح و شام
ورنہ انساں تو نظر آتا ہے اس پر خال خال

اس میں ایسی کھائیاں ہیں ایسے ایسے غار ہیں
دَفن ہو سکتا ہے جن میں آدمی بعد از وِصال

ڈگمگا جاتے ہیں ریڑھے لڑکھڑا جاتی ہے جیپ
واپس آ جائے سلامت سائیکل کی کیا مجال

مینہ برس جائے تو چل سکتی ہیں اس پر کشتیاں
ڈوب جانے کا بھی ہو جاتا ہے اکثر اِحتمال

اس کی ڈھلوانوں پہ موٹر کا دھڑک جاتا ہے دِل
اس کے موڑوں پر لرز جاتے ہیں اکثر باکمال

اس پہ جانے کا کبھی ہوتا ہے جس کو اِتّفاق
اس کے لَوٹ آنے کا پیدا ہی نہیں ہوتا سوال

سوچتا رہتا ہوں کب میرے وظیفے کی طرح
اس کی بدحالی کا آتا ہے حکومت کو خیال

(اندیشۂ شہر)

☆☆☆☆

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تحریر کیجیے:

(الف) شاعر کس سڑک کو بے مثال کہہ رہا ہے؟

(ب) مذکورہ سڑک پر گھوڑوں پر کیا بیتی؟

(ج) سڑک پر چلنے والی کن سواریوں کا حلیہ بگڑتا ہے؟

(د) سڑک پر جسے جانا پڑے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

(ہ) شاعر نے نظم کے آخری شعر میں کسے توجہ دلائی ہے؟

۲۔ نظم میں مثال، انتقال، حال، شِغال اور وصال ہم آواز الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ایسے الفاظ کیا کہلاتے ہیں؟

۳۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) شاعر کے پیشِ نظر یہ نظم لکھنے کا مقصد ہے:

(i) تنقید برائے تنقید (ii) مزاح

(iii) طنز برائے اصلاح (iv) مبالغہ آرائی

(ب) یہ نظم کس شاعر نے لکھی ہے؟

(i) جمیل الدین عالؔی　(ii) دلاور فگار

(iii) محمود سرحدی　(iv) ضمیر جعفری

(ج) جو شخص اس سڑک پر گیا پھر:

(i) تھک کر چُور رہوا　(ii) زخمی ہو کر آ گیا

(iii) کبھی لوٹ کر نہ آیا　(iv) پھسل پڑا

(د) یہ نظم کس مجموعے سے لی گئی ہے؟

(i) اندیشۂ شہر　(ii) مطلع عرض ہے

(iii) سنگینے　(iv) فی سبیل اللّٰہ

(ہ) شاعر نے کس سڑک کا مضحکہ اُڑایا ہے؟

(i) مال روڈ　(ii) مال گودام روڈ

(iii) طارق روڈ　(iv) بندر روڈ

(و) اس سڑک پر تانگے اُلٹ جانے سے گھوڑوں پر کیا گزرتی ہے؟

(i) بھاگ جاتے ہیں　(ii) بے ہوش ہو جاتے ہیں

(iii) مرجاتے ہیں　(iv) بیٹھ جاتے ہیں

(ز) سڑک پر شغال کے چیخنے سے واضح ہوتی ہے:

(i) ویرانی　(ii) آمدورفت

(iii) رونق ہی رونق　(iv) اُداسی

۴۔ نظم کو ذہن میں تازہ کریں اور درجِ ذیل مصرعوں کو مکمل کریں:

(الف) جس قدر ویراں ہے یہ، ہیں اس قدر وہ ....

(ب) دفن ہو سکتا ہے جن میں .... بعد از وصال

(ج) .... جاتے ہیں ریڑھے، لڑکھڑا جاتی ہے جیپ

(د) اس پہ جانے کا کبھی ہوتا ہے جس کو ....

(ہ) سوچتا رہتا ہوں کب میرے .... کی طرح

۵۔ نظم کا خلاصہ تحریر کریں۔

۶۔ نظم کا مرکزی خیال دو تین جملوں میں لکھیے۔

سرگرمیاں

ا۔ کسی اور مزاحیہ شاعر کی ایک نظم جماعت میں سنائی جائے۔

۲۔ یہ نظم کاپیوں پر لکھیں۔

۳۔ شاعر نے نظم میں سڑک کا مزاحیہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ پطرس بخاری نے جی ٹی روڈ کا جو حلیہ اپنے مضمون ''لاہور کا جغرافیہ'' میں بیان کیا ہے، اُستاد صاحب کی مدد سے وہ تلاش کر کے جماعت میں سنایا جائے۔

اساتذہ کرام کے لیے

ا۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مزاح نگار صورتِ واقعہ سے کس طرح مزاح پیدا کرتا ہے۔

۲۔ طلبہ کو بتائیں کہ بات پُر لطف انداز میں کیسے کہی جا سکتی ہے۔

۳۔ طلبہ کو بتائیں کہ عام نظم اور مزاحیہ نظم میں کیا فرق ہوتا ہے۔

۴۔ طلبہ سے دریافت کریں کہ اُنھوں نے اور کوئی مزاحیہ نظم پڑھی ہے تو وہ رسالہ یا کتاب جماعت میں لا کر دوسروں کو سنائیں۔

حصّہ غزل

حسرت موہانی
(۱۸۷۵ء-۱۹۵۱ء)

حسرتؔ موہانی کا اصل نام سیّد فضل الحسن اور حسرتؔ تخلص تھا۔ آپ یو پی کے قصبے موہان میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے موہانی کہلائے۔ ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا۔ کچھ عرصہ ادبی رسالہ اُردوئے معلیٰ نکالتے رہے، پھر ان کی باغیانہ تحریروں کی وجہ سے انگریز حکومت نے یہ رسالہ بند کر دیا۔

حسرتؔ موہانی تحریکِ آزادی کے اہم رہنما تھے اور برطانوی سامراج کی مخالفت کی وجہ سے انھیں طویل عرصے تک قید و بند کی صعُوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اس زمانے میں قیدِ بامُشقّت انتہائی سخت اور تکلیف دہ ہوتی تھی۔ روزانہ ایک مَن گیہوں دستی چکی پر پیسنا پڑتا تھا۔ حسرتؔ موہانی کا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

ہے مشقِ سخن جاری ، چکّی کی مَشقّت بھی
اک طُرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

۱۹۴۶ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مجلسِ قانون ساز کے رُکن منتخب ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی، وہ بھارت ہی میں مقیم رہے اور بھارتی پارلیمنٹ میں ہمیشہ کلمۂ حق بلند کرتے رہے۔

حسرتؔ موہانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ عشق و عاشقی کے جذبات ان کی غزل میں بہت نمایاں ہیں اور اس کا بنیادی عنصر تغزّل ہے، اس لیے انھیں ''رئیس المتغزّلین'' کا لقب دیا گیا ہے۔

حسرت، اعلیٰ پائے کے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ، انتقادِ ادبیات میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ زبان و بیان کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی ہے۔ ان کی تصانیف میں نکاتِ سخن، انتخابِ سخن، مشاہداتِ زنداں، کلیاتِ حسرت موہانی اور انتخاب اُردوے معلّٰی شامل ہیں۔

غزل

تدریسی مقاصد

۱۔ حسرتؔ موہانی کے شعری اُسلوب سے واقفیت دلانا۔
۲۔ طلبہ میں غزل کی ہیئت کا ادراک پیدا کرنا۔
۳۔ حسرتؔ موہانی کی اسیری اور قیدِ بامَشقّت کے ذکر کے ساتھ ان کی حبسیاتی شاعری کا تعارف کرانا۔
۴۔ طلبہ کو مطلع اور مقطع کے اصطلاحی مفہوم سے آگاہ کرنا۔

مُصیبت بھی راحت فزا ہو گئی ہے
ترِی آرزُو رہنُما ہو گئی ہے

یہ وہ راستا ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر ، صبا ہو گئی ہے

مَیں درماندہ اس بارگاہِ عطا کا
گُنہ گار ہوں ، اک خطا ہو گئی ہے

ترِے رُتبہ دانِ محبت کی حالت
ترِے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے

پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرتؔ
جب اس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے

(کلیاتِ حسرتؔ موہانی)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے جوابات لکھیے:

(الف) شاعر کے ہاں مصیبت کے ''راحت فزا'' ہونے کی وجہ کیا ہے؟

(ب) کون سے راستے پر چلنے سے مصیبت خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے؟

(ج) شاعر منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے پُر امید ہے، کیوں؟

۲۔ قوسین میں دیے گئے موزوں لفظ سے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) محبوب کی............رہنما بن گئی۔ (محبت، جدائی، آرزو)

(ب) غزل کے چوتھے شعر میں حالت بدلنے سے مراد حالت کا............ہونا ہے۔ (غیر، بہتر، بدتر)

(ج) اس غزل میں ہم قافیہ الفاظ کی تعداد............ہے۔ (چھے، سات، آٹھ)

۳۔ حسرتؔ موہانی کی غزل کے متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) کون سی چیز راحت فزا ہو گئی ہے؟

(i) رنج (ii) مصیبت

(iii) ناکامی (iv) حسرت

(ب) شاعر نے کس چیز کو رہنما ٹھہرایا ہے؟

(i) وصلِ محبوب (ii) محبوب کی تمنا

(iii) واعظ کی نصیحت (iv) غمِ روزگار

(ج) کون سا راستہ ہے جہاں بادِ صرصر صبا ہو گئی ہے؟

(i) راہِ محبت (ii) دیارِ وفا

(iii) رہِ دیارِ غیر (iv) راہِ وفا

(د) انتہا تک پہنچنے کی شرط کیا ہے؟

(i) ابتدا کرنا (ii) جہدِ مسلسل

(iii) ایثار (iv) چاہت اور محنت

۴۔ حسرت موہانی کی اس غزل کے قوافی اور ردیف الگ کر کے لکھیے۔

۵۔ غزل کے تیسرے شعر اور مقطع کی تشریح کیجیے۔

۶۔ درجِ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے:

راحت فزا، صرصر، درماندہ، بارگاہِ عطا، انتہا

۷۔ اس غزل کا جو شعر آپ کو سب سے زیادہ پسند ہو، اسے اپنی کاپی پر خوش خط لکھیں اور پسندیدگی کی وجہ بھی تحریر کیجیے۔

۸۔ اس غزل کا مطلع اور مقطع کاپیوں میں خوش خط لکھیں۔

مطلع:

اس کے معنی ''طلوع ہونے کی جگہ'' کے ہیں۔ اِصطلاح میں کسی غزل یا قصیدے کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں، بشرطیکہ اس کے دونوں مصرعے، ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوں۔ غالبؔ کی ایک غزل کا مطلع اس طرح ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مِرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مِرے آگے

مقطع:

غزل کے آخری شعر کو، جس میں شاعر اپنا تخلُّص استعمال کرتا ہے، مقطع کہتے ہیں۔ اگر تخلص موجود نہ ہو تو وہ شعر مقطع نہیں ہوگا، بلکہ آخری شعر ہوگا۔ ناصرؔ کاظمی کی ایک غزل کا مقطع ہے:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

سرگرمیاں

۱۔ انٹرنیٹ یا کسی دیگر ذریعے سے حسرتؔ موہانی کی تصویر تلاش کریں۔ تصویر چارٹ پر لگائیں اور حسرتؔ کے تین اشعار خوش خط لکھیں۔

۲۔ ہر طالبِ علم کچھ شعر زبانی یاد کرے۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ حسرتؔ موہانی کے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات طلبہ کو بتائے جائیں اور اس پس منظر میں اس غزل کا مطالعہ کرایا جائے۔

۲۔ طلبہ کو حسرتؔ کی سیاسی جدوجہد، رکن پارلیمنٹ ہونے اور قید و بند کے بارے میں بتایا جائے۔

۳۔ حسرتؔ موہانی کی کم از کم دو غزلیں طلبہ کو سنائی جائیں۔

جگؔر مرادآبادی
(۱۸۹۰ء–۱۹۶۰ء)

جگؔر کا اصل نام علی سکندر اور تخلص جگؔر تھا۔ بنارس میں پیدا ہوئے لیکن ان کا خاندان بوجُوہ بنارس سے ہجرت کر کے مراد آباد میں آبسا تھا، چنانچہ ''جگؔر مرادآبادی'' کہلائے اور اسی قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ جگؔر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، جس میں فارسی کی چند ابتدائی کتابیں شامل تھیں۔ شاعری کا ذوق ورثے میں پایا تھا۔ جگؔر کے والد علی نظر، صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جگؔر اپنی اُفتادِ طبع کے لحاظ سے نیک، درویش منش اور سلیم الطبع تھے۔ انھوں نے حج بھی کیا اور مدینہ منورہ میں نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں بہت سی نعتیں بھی کہیں۔ دین کی طرف ان کی توجہ اور رَغبت میں اصغر گونڈوی کا بھی دخل تھا۔

جگؔر مشاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی آواز بہت اچھی تھی، وہ شعر خوانی ترنّم سے کرتے، اس لیے مشاعرہ لُوٹ لیتے تھے۔ ان کے ہاں تغزّل کے عناصر نمایاں ہیں۔ ابتدائی دور میں وہ داغؔ دہلوی سے متاثر تھے لیکن پھر غزل گوئی میں اپنا ایک خاص رنگ پیدا کیا، تاہم غزل کی کلاسیکی روایت کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کا کلام پُختہ ہے اور اس میں ایک والہانہ پن اور نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔

ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں آتشِ گل، داغِ جگر اور شعلۂ طور زیادہ مقبول ہوئے۔

غزل

تدریسی مقاصد

۱۔ جگؔر کی غزل کے محاسن سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ میں شعر فہمی کا ذوق پیدا کرنا۔
۳۔ یہ غزل سہلِ ممتنع کی مثال ہے۔اس کی وضاحت کرنا اور معنی ومفہوم واضح کرنا۔
۴۔ طلبہ کو ردیف اور قافیہ کا فرق بتانا۔

آدمی آدمی سے مِلتا ہے
دل مگر کم کسی سے مِلتا ہے

بھول جاتا ہُوں مَیں ستم اُس کے
وہ کچھ اس سادگی سے مِلتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ ، تیری ہنسی سے مِلتا ہے

سلسلہ ، فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے مِلتا ہے

مِل کے بھی جو کبھی نہیں مِلتا
ٹُوٹ کر دل ، اُسی سے مِلتا ہے

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے مِلتا ہے

رُوح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہمسائگی سے مِلتا ہے

(کلیاتِ جگر)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھیے:

(الف) اس غزل کے مطلع کی نشان دہی کیجیے اور اپنی کاپی میں اسے الگ لکھیے۔

(ب) پھولوں کا رنگ ہنسی سے مِلنے کا مفہوم واضح کیجیے۔

(ج) ہوش اور بے خودی کے مِلنے سے دنیا کے کاروبار کیسے سنورتے ہیں؟

(د) مطلع میں کس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

(ہ) پانچویں شعر میں مِل کر نہ ملنے سے کیا مراد ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جُملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

آدمی، دل، ستم، ہنسی، قیامت، ہوش، روح، ہمسائگی

۳۔ مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

مِل کے بھی جو کبھی نہیں مِلتا ٹُوٹ کر دل، اُسی سے مِلتا ہے

۴۔ جگر مراد آبادی کی غزل کا متن ذہن میں رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) محبوب کے سادگی سے ملنے کا شاعر پر کیا اثر ہوتا ہے؟

(i) خوشی سے پھولا نہیں سماتا (ii) محبوب کے ستم بھول جاتا ہے
(iii) نشہ سا چھا جاتا ہے (iv) ہر غم بھول جاتا ہے

(ب) پھولوں کا رنگ محبوب کی کس بات سے ملتا ہے؟

(i) ہنسی سے (ii) شکل وصورت سے

(iii) تازگی اور نزاکت سے (iv) خوش پوشی سے

(ج) فتنۂ قیامت کا سلسلہ کس سے ملتا ہے؟

(i) محبوب کی خوش قامتی سے (ii) خوش ادائی سے

(iii) انگڑائی سے (iv) محفل آرائی سے

(د) دل ٹوٹ کر کس سے ملتا ہے؟

(i) کج ادا سے (ii) دلربا سے

(iii) خوش ادا سے (iv) مل کے بھی جو نہیں ملتا

(ہ) بے خودی سے ہوش آنے پر کیا ہوتا ہے؟

(i) افسوس (ii) کاروبارِ جہاں سنور جاتے ہیں

(iii) بے خودی کو جی چاہتا ہے (iv) اداسی بڑھ جاتی ہے

(و) روح کو محبت کا مزہ کب ملتا ہے؟

(i) دل کی ہمسائیگی میں (ii) ہجر وفراق میں

(iii) وصال میں (iv) تنہائی اور یکسوئی میں

۵۔ قوسین میں دیے گئے الفاظ سے درست جواب کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے:

(الف) .... مگر کم کسی سے ملتا ہے (محبوب، دل، آدمی)

(ب) دوسرے شعر میں ''وہ'' سے مراد............................ ہے۔ (محبوب، آدمی، دوست)

(ج) کاروبارِ............................ سنورتے ہیں (عاشقاں، جہاں، دنیا)

(د) ساتواں شعر غزل کا............................ ہے۔ (مطلع، مقطع، آخری شعر)

۶۔ اس غزل میں ردیف اور قوافی کی نشان دہی کیجیے۔

قافیہ:

کسی شعر کے آخر میں آنے والے ہم وزن اور ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ اگر شعر میں ردیف بھی ہو (ردیف کا ہونا

لازمی نہیں) تو قافیہ ردیف سے پہلے آئے گا، مثلاً:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے — اجل مر رہی تُو کہاں آتے آتے

یہاں پہلے شعر میں ''ہوا'' اور ''دوا'' جب کہ دوسرے شعر میں ''یہاں'' اور ''کہاں'' قافیے ہیں۔

ردیف:

کسی شعر میں قافیے کے بعد آنے والے ایک جیسے لفظ یا ایک جیسے الفاظ ردیف کہلاتے ہیں۔

اگر غزل کے مطلع میں ردیف موجود ہو تو باقی اشعار کے دوسرے مصرعے میں ردیف آتی ہے، تاہم غزل غیر مردّف بھی ہوتی ہے۔

''قافیہ'' کے ضمن میں دیے گئے اشعار میں ''کرے کوئی'' اور ''آتے آتے'' ردیف ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ جگرؔ کی یہ غزل زبانی یاد کریں اور کاپی میں لکھیں۔

۲۔ جماعت کے کمرے میں دُرست تلفّظ کے ساتھ اس غزل کی بلند خوانی کی جائے۔

۳۔ جگرؔ مرادآبادی کے حالاتِ زندگی اپنے استاد سے پوچھ کر کاپی پر نوٹ کریں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کو جگرؔ کی کوئی اور غزل لکھوائی جائے اور پھر اُن سے پڑھوا کر سُنی جائے۔

۲۔ جگرؔ کے حالاتِ زندگی طلبہ پر واضح کیجیے۔

۳۔ سہلِ ممتنع کی وضاحت کرتے ہوئے میر تقی میرؔ کی کوئی غزل اور مومنؔ کی غزل ''تُم مِرے پاس ہوتے ہو گویا'' طلبہ کو سُنائی جائے۔

۴۔ غزل اور نظم کا فرق بتایا جائے۔

۵۔ طلبہ کو اچھی غزل کی خوبیاں سمجھائیں۔

فراقؔ گورکھپوری

(۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء)

فراقؔ گورکھ پوری، گورکھ پور کے ایک مُعزّز ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ کائستھ ہندو گھرانوں کے دستور کے مطابق، ابتدائی تعلیم اُردو اور فارسی میں ہوئی۔ بی اے اِلٰہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ زمانۂ طالبِ علمی ہی سے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے بطور پرائیویٹ امیدوار الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی ادبیات کا امتحان ریکارڈ نمبروں کے ساتھ پاس کیا، جس کے بعد اسی یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔

ابتدا میں افسانہ نگاری بھی کی مگر بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو تازگی اور توانائی عطا کی۔ ناقدین انھیں میرؔ کے رنگِ تغزّل کا نمایندہ شاعر قرار دیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے بقول:

''غزل کا آیندہ جو رنگ و آہنگ ہوگا، اس کی ساخت و پرداخت میں فراقؔ کا بڑا اہم حصہ ہوگا۔''

فراقؔ گورکھپوری نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی مضامین سے بھی شہرت حاصل کی۔

ان کی تصانیف میں شُعلۂ ساز، روحِ کائنات، اندازے، حاشیے، شبنمستان، اُردو کی عشقیہ شاعری اور اردو غزل گوئی شامل ہیں۔ حکومتِ بھارت اور سوویت یونین کی طرف سے انھیں متعدّد اِعزازات سے نوازا گیا۔

غزل

تدریسی مقاصد

۱۔ فراقؔ کی شاعری کی فنی ومعنوی خوبیوں سے تعارف کرانا۔

۲۔ اردو غزل کے اوصاف سے طلبہ کو آشنا کرنا۔

۳۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزا اور اس کی نمایاں خصوصیت ایجاز واختصار کے بارے میں طلبہ کو بتانا۔

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

ایک مُدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ، ایسا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست ، کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سَوا
آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

رنگ وہ فصلِ خزاں میں ہے کہ جس سے بڑھ کر
شانِ رنگینیِ حُسنِ چمن آرا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کُنجِ زنداں بھی نہیں وُسعتِ صحرا بھی نہیں

ہم اُسے منھ سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے ، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

(شبنمستان)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیں:

(الف) فراؔق گورکھپوری کی شاملِ نصاب غزل ان کے کس مجموعے سے لی گئی ہے؟

(ب) شاعر نے سر اور دل میں کس چیز کی کمی کا ذکر کیا ہے؟

(ج) شاعر کو کسی کی یاد کتنے عرصے سے نہیں آئی؟

(د) شعری اصطلاحات کے حوالے سے اس غزل کی ردیف کیا ہے؟

۲۔ آپ حسرتؔ موہانی کی غزل کی مشق میں مطلع اور مقطع کے بارے میں پڑھ چکے ہیں، اس کی روشنی میں درجِ ذیل سوالات میں سے درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) درجِ ذیل شعر قواعد کے لحاظ سے کیا ہے؟

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

(i) غزل کا پہلا شعر (ii) غزل کا آخری شعر (iii) مطلع (iv) مقطع

(ب) ہم اُسے مُنھ سے برا تو نہیں کہتے کہ فراؔق
دوست تیرا ہے، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

یہ شعر قواعد کی رو سے کیا ہے؟

(i) مطلع (ii) مقطع (iii) عام شعر (iv) آخری شعر

(ج) اس غزل میں ردیف کیا ہے؟

(i) تمنا، بھروسا (ii) نہیں (iii) بھی نہیں (iv) غیر مردّف ہے

(د) اس غزل میں شکیبا، اچھا، ایسا قواعد کی رو سے کیا ہیں؟

(i) قافیے (ii) ردیف (iii) فعل (iv) استعارہ

۳۔ فراؔق گورکھپوری کی اس غزل کا کون سا شعر آپ کو زیادہ پسند ہے؟ وجہ بھی لکھیں۔

۴۔ فراؔق کی غزل کے متن کو ذہن میں رکھ کر درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) سر میں سودا بھی نہیں دل میں

(i) دردِ دل بھی نہیں (ii) چاہت بھی نہیں (iii) تمنا بھی نہیں (iv) اُمنگ بھی نہیں

(ب) سکونِ دلِ وحشی کا مقام کہاں نہیں؟

(i) کُنجِ زنداں میں (ii) وسعتِ صحرا میں (iii) زمیں میں (iv) کہیں نہیں

(ج) شاعر کو محبوب کی یاد کب سے نہیں آئی ؟

(i) ایک ماہ سے (ii) ایک سال سے (iii) ایک مدت سے (iv) ایک عرصے سے

(د) مقطعے میں کسے برا نہ کہنے کا ذکر کیا گیا ہے؟

(i) محبوب کے دوست کو (ii) رقیب کو (iii) اپنے دوست کو (iv) جو بُرا لگے

۵۔ مصرعے مکمل کریں:

ایک ____________ سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں

یوں تو ____________ اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے ______

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا ____________

____________ تیرا ہے، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

۶۔ غزل کے پہلے اور دوسرے شعر کی تشریح کریں۔

۷۔ درجِ ذیل الفاظ وتراکیب کے جملے بنائیے:

سودا، بھروسا، دیوانۂ عشق، ترکِ محبت، شکیبا، غفلت

سرگرمیاں

۱۔ فراقؔ کی اس غزل کو زبانی یاد کریں اور کاپی میں خوش خط لکھیں۔

۲۔ ہر طالبِ علم کسی غزل سے اپنی پسند کے دو شعر سنائے۔

۳۔ طلبہ کے درمیان جماعت کے کمرے میں بیت بازی کا مقابلہ کرایا جائے۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ طلبہ کے سامنے مردّف اور غیر مردّف غزل کی وضاحت کریں۔

۲۔ طلبہ کو مقطع اور آخری شعر کا فرق بتائیں۔

۳۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ غزل دیگر اصنافِ شعر کے مقابلے میں اپنی سادگی، سلاست، شستگی اور ایجاز واختصار کی وجہ سے ہر دور میں مقبول رہی ہے۔

آدا جعفری
(۱۹۲۴ء - ۲۰۱۵ء)

آدا جعفری بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام مولوی بدرالحسن تھا۔ ان کا اصل نام عزیز جہاں ہے۔ آدا تخلّص اختیار کیا۔ وطن کی نسبت سے آدا بدایونی کہلائیں۔ نورالحسن جعفری سے شادی ہوگئی تو آدا جعفری ہوگئیں۔ تقسیم کے بعد ان کا خاندان پاکستان آ گیا۔ ان میں شعر گوئی کی اُمنگ اور فطری صلاحیت موجود تھی۔ نظم نگاری سے شاعری کی ابتدا کی، پھر غزل کہنے لگیں۔ ابتدائی دور میں آثر لکھنوی سے، بعدازاں اختر شیرانی سے اصلاح لی۔ آدا جعفری کی پہلی غزل رسالہ رومان میں شائع ہوئی۔ ان کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد نے انھیں ''کمالِ فن ایوارڈ'' دیا ہے۔ انھیں ادب میں حسنِ کارکردگی کا صدارتی تمغا بھی مل چکا ہے۔

ان کی غزلوں میں تغزّل کے عناصر، لطیف احساسات، ایک بے نام افسُردگی اور جدائی کی کسک موجود ہے۔

ان کی خودنوشت جو رہی سو بے خبری رہی کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں شہرِ درد، مَیں ساز ڈھونڈتی رہی، غزالاں تم تو واقف ہو اور سازِ سخن بہانہ ہے شامل ہیں۔ ان کی شاعری کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

غزل

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو ادا جعفری کے مخصوص اسلوبِ غزل گوئی سے رُوشناس کرانا۔

۲۔ اُردو غزل کے اوصاف سے طلبہ کو آشنا کرنا۔

۳۔ طلبہ کو اُردو کی جدید اور روایتی غزل کے فرق سے آگاہ کرنا۔

یہ فخر تو حاصل ہے ، بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
دوچار قدم ہم بھی ترے ساتھ چلے ہیں

جلنا تو چراغوں کا مقدّر ہے ازل سے
یہ دِل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں

نازک تھے کہیں رنگِ گُل و بُوئے سمن سے
جذبات کہ آداب کے سانچے میں ڈھلے ہیں

تھے کتنے ستارے کہ سرِشام ہی ڈوبے
ہنگامِ سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں

جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور
تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں

اک شمع بجھائی تو کئی اَور جلا لیں
ہم گردشِ دوراں سے بڑی چال چلے ہیں

(غزالاں تم تو واقف ہو)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجیے:

(الف) غزل کے مطلع میں شاعرہ کس بات پر نازاں ہے؟

(ب) دل کے کنول اور چراغوں میں کیا بنیادی فرق بتایا گیا ہے؟

(ج) ''اک شمع بجھائی............'' سے کیا مراد ہے؟

۲۔ دیے گئے جوابات میں سے درست جواب پر نشان (✓) لگائیں:

(الف) شاعرہ کو کس بات پر فخر ہے؟

(i) اچھا شعر کہنے پر (ii) محبوب کے ہم قدم ہونے پر

(iii) آسماں کے مہربان ہونے پر (iv) محبوب کے التفات پر

(ب) اک شمع بجھائی تو:

(i) ہم پچھتائے بہت (ii) کئی اور جلالیں

(iii) سو رہے (iv) بے سکون ہو گئے

(ج) یہ غزل کس مجموعۂ کلام سے لی گئی ہے؟

(i) شہرِ درد (ii) سازِ سخن بہانہ ہے

(iii) غزالاں تم تو واقف ہو (iv) میں ساز ڈھونڈتی رہی

(د) ''جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور'' میں کڑی دھوپ سے مراد ہے:

(i) سورج کی حدّت (ii) زمانے کے مصائب

(iii) محبوب کی بے رخی (iv) عام دکھ اور بیماری

(ہ) پہلے شعر میں ''چلے'' کو کہیں گے:

(i) مطلع (ii) ردیف

(iii) قافیہ (iv) مقطع

(و) ''نازک تھے کہیں رنگِ گُل و بُوے سمن سے''میں رنگ و بُو سے مراد ہیں:

(i) آداب (ii) جذبات

(iii) تصوّرات (iv) خیالات

(ز) غزل کا چھٹا شعر ہے:

(i) مطلع (ii) مقطع

(iii) عام شعر (iv) آخری شعر

۳۔ درجِ ذیل الفاظ پر اِعراب لگائیں:

مقدر، جذبات، گُل ، سمن، خورشید، شمع، گردش

۴۔ کالم (الف) کے الفاظ کالم (ب) کے الفاظ سے ملائیں:

کالم(الف)	کالم(ب)
چراغوں کا مقدر	سرِ شام
رنگِ گُل	خورشید
ستارے	تیور
ہنگامِ سحر	بوئے سمن
کڑی دھوپ	جلنا

۵۔ آپ آدا جعفری کی اس غزل کی ردیف اور قوافی کی نشان دہی کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اس غزل کی ردیف اور قوافی اپنی کاپیوں پر خوش خط لکھیں اور اپنے استاد کو دکھا کر تصحیح کرائیں۔

۲۔ آدا جعفری کی کوئی اور غزل کاپیوں میں نوٹ کریں۔

۳۔ جماعت کے کمرے میں اس غزل کو درست تلفّظ کے ساتھ بلند آواز سے پڑھا جائے۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ آدا جعفری کے سوانحی کوائف اور شاعری کی خصوصیات سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

۲۔ طلبہ کو آگاہ کیا جائے کہ غزل کے موضوعات وقت کے ساتھ بدلے ہیں۔ پہلے صرف حسن و عشق ہی غزل کا موضوع تھا۔ اب اس میں ہر قسم کے موضوعات پر غزلیں کہی جا رہی ہیں۔

۳۔ اگر میسّر آئے تو آدا جعفری کی خودنوشت جو رہی سو بے خبر رہی سے اقتباسات پڑھ کر طلبہ کو سنائے جائیں۔

۴۔ آدا جعفری کے مجموعہ کلام غزالاں تم تو واقف ہو سے کم از کم دو اور غزلیں طلبہ کو سنائی جائیں۔

☆☆☆